الاقربأ

اسلام آباد

غالب

حالی

الاقربا فاؤنڈیشن اسلام آباد

سہ ماہی

الاقرباء

اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۴

اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۶ء

الاقرباء فاؤنڈیشن۔ اسلام آباد

مکان نمبر ۴۶۴ سٹریٹ نمبر ۵۸ آئی ۸/۳ اسلام آباد

فون ۴۴۴۲۶۸۶ فیکس ۲۱۰۲۶۷۰-۰۵۱

E-mail: alaqrebaislamabad@hotmail.com

بیرونِ ملک معاونین خصوصی

یورپ

بیرسٹر سلیم قریشی

برکلے چیمبر۔2۔اے برکلے روڈ۔

لیٹن سٹون(Leytonstone)لندن۔

ای II'3ڈی جی' فون 5582289(0208)

فیکس 5583849 (0208)

ای میل: qureshi@ss.life.co.uk

امریکہ

محمد اویس جعفری

218 t ارتھ ایسٹ 175 سٹریٹ سیاٹل(Seattle)

واشنگٹن 98155-3516 (یو۔ایس۔اے)

فون 361-8094 (206) دفتر 679-5321 (360)

فیکس 361-0414 (206)

ای میل jafreyomi@gmail.com

زرتعاون

فی شمارہ	۷۰ روپے
سالانہ	۳۵۰ روپے
بیرون ملک فی شمارہ	۶ ڈالر/۴ پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ	۲۵ ڈالر/۱۵ پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ	اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۶ء
ناشر	سید ناصرالدین
کمپوزنگ	نعیم کمپوزرز۔اسلام آباد
طابع	ضیاء پرنٹرز۔اسلام آباد

مندرجات

''غزالاں تم تو واقف ہو۔۔۔!''

اُردو ادب میں غزال و غزل کی روایتوں کا رمز شناس' افسانہ و افسوں کی کیفیات کا ترجمان اور نقد و نظر کی بصیرتوں کا امین جسے دنیا احمد ندیم قاسمی کے نام سے جانتی ہے فانی تھا اور فنا ہوگیا لیکن ریگزار وقت پر اپنے فکر و فن کے وہ نقوش ثبت کرگیا جو تابناک ہی نہیں ابدی بھی ہیں۔ کوئی بھی خطہء زمین مشرف بذات نہیں ہوتا بلکہ شخصیتوں کا فیضان اسے شرف عطا کرتا ہے چنانچہ شہرتِ دوام اب ضلع خوشاب کی پسماندہ سرزمین کے اُس قریہء گمنام کا جسے مقامی دیہی آبادی ''انگہ'' کے نام سے پہچانتی ہے نہ صرف مقدر بن چکی ہے بلکہ عالمی سطح پر ادب کے حوالوں میں قاسمی کی پاکستان سے نسبت ہمارے قومی افتخار کی علامت بھی بنی رہے گی۔

مرحوم کی طویل ادبی زندگی نہ صلہ و ستائش کی تمنا کی مظہر ہے اور نہ ذاتی نمود و نمائش کی آئینہ دار بلکہ ایسے سنگ ہائے میل سے عبارت ہے جو انہیں بین الاقوامی سطح کا فنکار قرار دیتے ہیں' ان کی فکری اور نظریاتی آفاقیت کے جلی عنوانات میں سب سے زیادہ مسحور کن پہلو ان کی انسان دوستی کا ہے جو اُن کی تمام تخلیقات میں روح بن کر سرایت کیے ہوئے ہے۔ افسانہ نگار قاسمی ہو یا شاعر و نقاد احمد ندیم وہ شخص اپنی ژرف نگاہی کے سبب زندگی کی نازک ترین حقیقتوں کا ترجمان بن کر ابھرا اور حقیر سے حقیر واقعات کی تہہ میں اُتر کر بے نام جذبوں اور بے سہارا آرزوؤں کو امر کر گیا۔ وہ ایک ''غریب و غیور'' فنکار تھا جسے نہ عُسرت احساسِ کمتری میں مبتلا کر سکی نہ وقت کی سرد مہری اُس کی سرگرمِ عمل زندگی کو شکست دے سکی۔ قاسمی صاحب کا تمام فن اسی حقیقت کا گواہ ہے ان کے اپنے الفاظ ہیں:

> ''میری خودنوشت میری نظموں' غزلوں' قطعوں' افسانوں اور مضمونوں میں موجود ہے ان میں وہ سب کچھ ہے جو ایک خودنوشت میں ہونا چاہیے

وہ حالات اور ماحول جن سے میری شخصیت صورت پذیر ہوئی، وہ تضادات جن میں مجھے پھنسنا پڑا، وہ ثقافتی روایات جن میں میرے بچپن کی تربیت وتہذیب ہوئی، وہ نظریات ومعتقدات جن کی توانائی نے مجھے زندگی اور انسان سے لازوال محبت کرنا سکھایا، وہ رشتے اور رابطے، وہ اپنائیتیں اور بے گانگیاں، وہ کامرانیاں اور محرومیاں، وہ اندھادھند پیار اور بے سبب نفرتیں جن سے زندگی کی رنگارنگی عبارت ہے۔۔۔ان سب کی محض جھلکیاں ہی نہیں، جزئیات کی حد تک مکمل تفصیلیں میرے شعروں اور افسانوں میں جمع ہیں۔"[1]

پُر جہت زندگی کا یہی وہ تنوع تھا جس نے ایک کم سواد قریے میں جنم لینے والے لڑکے "احمد شاہ" کو ادبی شہرت ومنزلت کی حدود سے ماورا کر کے بیکراں بنا دیا۔ یہ وہی احمد شاہ تھا جس کی ابتدائی پہچان یہ تھی کہ "موٹے موٹے نقوش کا ایک صحت مند لڑکا اپنے گاؤں کی پہاڑیوں اور وادیوں میں جھاڑیوں کی خشک ٹہنیاں اور مویشیوں کا خشک گوبر چُنتا تھا" (مکتوب بنام صہبا)

چنانچہ وقت اپنی تمام تر سفاکیوں کے باوجود گواہ ہے کہ وہی احمد شاہ جو خشک گوبر چُنتا تھا، جب احمد ندیم قاسمی بن کر فن کے افق پر طلوع ہوا تو دنیا نے اس کے فن کو خراجِ تحسین پیش کیا اور اُس کے اِفسانوں اور نظموں کے مجموعے روسی، چینی اور یورپ کی کئی زبانوں نیز فارسی میں ترجمہ ہوئے اور مختلف جامعات میں اُس کے فکر وفن پر تحقیقی مقالات لکھے جانے کے علاوہ اس کی زندگی ہی میں تاشقند یونیورسٹی میں پی۔ایچ۔ڈی کا تھیسس لکھا گیا۔ "انسان عظیم ہے" اور "پتھر" جیسی نظموں کے علاوہ "ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد" اور "پرمیشر سنگھ" جیسے افسانوں نے ندیم کو عالمی شناخت عطا کی، یہی نہیں بلکہ ہمارا ادب جو معاصرانہ رقابت ومنافقت اور ہوس وحسد کی کریہہ الاصل روایتوں سے آلودہ نظر آتا ہے قاسمی کے لئے اپنے دامن میں عظیم معاصرین کے

---

[1] مکتوب بنام صہبا لکھنوی مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۴ء

گلہائے ستائش بھی لیے ہوئے ہے جو اُس جیسے منفرد اہل قلم کا حق تھا۔ ان مداحوں میں جوش وفیض، راشد وحفیظ جیسی ''نابغۂ شعر'' ہستیوں کے علاوہ معروضی تنقید کے اکابر میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری ' ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور پروفیسر مجتبیٰ حسین جیسی شخصیات شامل ہیں جنہوں نے قاسمی صاحب کی عظمتِ فن اور انسان دوستی کو برملا خراج تحسین پیش کیا ہے۔

مشاہدہ و تجربہ کسی بھی فنکار کا سرمایہ ہوتے ہیں اور قاسمی صاحب اس سرمایہ کے امین بھی تھے اور قاسم بھی۔ اُن کا سرمایۂ فکر و فن' زندگی کے وہ تمام نشیب و فراز ہیں جن کی آغوش میں انہوں نے اپنے شب و روز بسر کئے' وہ تمام تلخ وشیریں حقیقتیں ہیں جو ان کے افسانوں اور کہانیوں میں تحلیل ہو گئیں اور جذبہ و احساس کی وہ تمام صداقتیں ہیں جو شعر کے حسین قالب میں ڈھل گئیں۔

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں   کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اُتر جاؤں

انہوں نے اپنے تیشۂ فکر اور قلم کی کاٹ سے معاشرہ کے ناسوروں پر نشتر زنی کا عمل نہایت ذہانت و ذکاوت اور فنکارانہ بصیرت سے انجام دیا وہ ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے میں اپنی بھرپور عملی صلاحیتوں کے ساتھ شریک تھے انہوں نے خونِ دل سے نخلِ ادب کی آبیاری کی اور عصری رجحانات کی اس انداز سے تہذیب و تربیت کی کہ مورّخ ایک رجحان ساز اہل قلم کی حیثیت سے اُنھیں ایک بلند مقام و مرتبہ دینے پر مجبور ہے' زندان و سلاسل بھی اُن کی قلمی زندگی کے اس عظیم تسلسل کو شکست نہ دے سکے اور کردار کی استقامت ہمیشہ ان کا نشانِ امتیاز بنی رہی۔

حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیم   وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

انجمن ترقی پسند مصنفین کا منشورِ فکر و فن وہ جن الفاظ میں بیان کرتے ہیں دراصل وہ ان کی اپنی ذات و صفات کے ترجمان ہیں:

غبارِ راہ سہی ہم نشانِ راہ بھی ہیں   جہاں گزیدہ بھی ہیں اور جہاں پناہ بھی ہیں
یہ سب درست کہ معتوب بھی تباہ بھی ہیں   شبِ سیاہ جہاں من نوید راہ بھی ہیں
عوام دوست ہیں یعنی گناہگار ہیں ہم   مورخوں سے مگر اس کے دادخواہ بھی ہیں

لبوں پہ گیت تو ہاتھوں میں ہے عنانِ حیات — کہ ہم تمدن وتہذیب کی سپاہ بھی ہیں
یہ انقلاب کی ہے اولیں جھلک کے ندیم — ہماری کھوج میں شاہانِ کج کلاہ بھی ہیں

ندیم کی عظمت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اگرچہ شاہان کج کلاہ کے سامنے انہوں نے کبھی اپنا سرِ غیور خم نہیں کیا لیکن وطن کی محبت مٹی کی خوشبو بن کر ہمیشہ اُن کے رگ و پے میں خونِ گرم کی طرح گردش کرتی رہی' انہوں نے ترکِ وطن کا کبھی تصور تک نہیں کیا۔

رہونگا اپنے وطن کے بہشت زاروں میں — جوان وادیوں' بلوان کوہساروں میں
یہ کچے مٹی کے گھر یہ غریب رشتہ دار — یہ آڑی ترچھی سی بوسیدہ چھپروں کی قطار
صبیح بچوں کے جھمگٹ یہ تنگ گلیوں میں — یہ پھول بننے کے انداز تازہ کلیوں میں

آج کے ادب اور ادیب دونوں کو اُس قلم کی حُرمت' لفظ کی صداقت' جذبہ و فکر کی طاقت اور کردار کی عظمت واستقامت کی ضرورت ہے جو قاسمی صاحب اپنے قابلِ تقلید ورثہ کی شکل میں لکھنے والوں کی نئی نسل کو سونپ گئے ہیں۔

ہر چند ان کی زندگی میں بھی بعض معاصرین کو ان سے اختلاف رہا اور ہو سکتا ہے کہ سمندر میں اُتر جانے والے اس دریائے ہنر کو بعد میں بھی ہدفِ تنقید بنایا جائے لیکن شاید اس حقیقت سے انکار نہ کیا جا سکے گا کہ قاسمی ایک عظیم فنکار' مُحب وطن شاعر اور انسان دوست قلمکار تھا جس کی رحلت سے پاکستان کا ادبی منظر اپنی نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی سے محروم ہو گیا ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی — دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

محمد شفیع عارف دہلوی

غالب کی شاعرانہ عظمت و آفاقیت

مرزا اسداللہ خاں غالب بلاشبہ انیسویں صدی کے وہ عظیم اور قابل صد افتخار شاعر ہیں جو کم و بیش ڈیڑھ سو سال سے برصغیر ہندو پاک کے افق شاعری پر نہایت آب و تاب کیساتھ جلوہ بار ہیں۔ اس طویل عرصہ میں اس علاقہ میں ہزاروں قابل قدر اور مایہ ناز شعراء کرام پیدا ہوئے مگر کسی نے بھی غالب کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ پر زور الفاظ میں موصوف کی شاعرانہ عظمت کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس تاجدار اقلیم شعر و سخن کی ایک ران کے نیچے اگر فلسفہ قدیم تھا تو دوسری کے نیچے جدید۔ اور یہ شہسوار اردو زبان کے منہ زور گھوڑے پر فارسی زبان کی باگیں کسے نہایت تیزی سے ایڑ لگاتا ہوا زمین سے آسمان اور آسمان سے عرش و کرسی اور نہ معلوم کہاں کہاں کے ترارے بھرتا پھرتا تھا۔

اس سر سبد گلشن شعر و ادب کو دوسرے شعراء کرام پر (بہ استثنائے اقبال جن کا رنگ اور پیغام بالکل مختلف تھا) فوقیت اور برتری کی بنیادی وجہ یا اس کے کلام کی دوامی کشش کا اصل راز یہ ہے، کہ اس نے انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو ایسے انوکھے اور اچھوتے انداز میں اجاگر کیا کہ ہر شخص نے اسے اپنے دل کی پکار سمجھا۔ اگر ایک طرف غالب کے کلام میں معاملاتِ حسن و عشق کی جلوہ ریزی ہے تو دوسری طرف انسان کی سسکتی آہوں فلک شگاف چیخوں، مجبوریوں، معاشرتی ناہمواریوں اور اخلاقیات و تصوف کی صورت گری ایسے دلکش انداز میں کی گئی ہے کہ انسان کا دل سن کر بے اختیار تڑپ اٹھتا ہے۔

غالب کی مقبولیت کی دوسری بڑی وجہ ان کا انداز بیان، حیرت انگیز تنوع، معنی آفرینی، ندرتِ تخیل، شوخی، طنز و ظرافت، وارداتِ قلبی کی تصویر کشی اور حقیقت نگاری ہے۔ ان کا طرۂ امتیاز جدت طرازی تھا نہ کہ روایات کی تقلید اگرچہ غالب کی زندگی میں ان کے فن کی بڑی عزت افزائی

ہوئی مگر حقیقتاً وہ جس مقبولیت عظمت اور شہرت کے مستحق تھے یا جس کے وہ خود متمنی تھے وہ انہیں نصیب نہ ہو سکی مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کے کلام کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا اور آج جہاں بڑے سے بڑا شاعر ان کا تتبع کرتا نظر آتا ہے وہاں غالب کے اشعار ضرب المثل یا زبان زدِ خاص و عام ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں دیوانِ غالب سے زیادہ نہ کسی کا دیوان پڑھا گیا' نہ سمجھا گیا' نہ طباعت پذیر ہوا اور نہ اس سے زیادہ کسی اور شاعر کے کلام کی شرحیں لکھی گئیں اور یہ جو کچھ ہوا وہ بالکل درست اور بجا ہوا اس لئے کہ اس صدی کا کوئی اور شاعر غالب سے زیادہ اس قدر دانی اور عزت افزائی کا اہل اور مستحق نہیں تھا۔

مرزا ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبداللہ بیگ خاں اور آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ شانِ خداوندی دیکھئے کہ باپ کے ہاتھ میں تلوار تو بیٹے کے ہاتھ میں قلم۔ مگر بیٹے نے اپنے قلم کی کاٹ سے دنیائے شعر و ادب میں ایک ہلچل مچا دی۔ اپنی صلاحیت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ مرزا بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے لہٰذا ان کی پرورش ان کے حقیقی چچا مرزا نصراللہ بیگ نے کی۔ ابھی غالب مشکل سے آٹھ سال کے ہوئے تھے کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد موصوف اپنے نانا جان غلام حسین رئیس آگرہ کی سرپرستی میں آ گئے۔ غالب کا بچپن اور لڑکپن آگرہ ہی میں گذرا اور انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور مولوی محمد معظم صاحب سے حاصل کی لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد ملا عبدالصمد نامی ایک ایرانی عالم جو نو مسلم مگر فارسی زبان کا ماہر تھا اور جو بسلسلہ سیر و سیاحت آگرہ وارد ہوا تھا مرزا نے اس کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور دو سال تک اس کے تبحرِ علمی سے فیض حاصل کیا۔

کہا جاتا ہے کہ مرزا اپنی جوانی میں بہت خوبصورت تھے اپنی خوش طبعی اور ظرافت کی وجہ سے جہاں جاتے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے اور محفل پر چھا جاتے۔ بہر حال قبل اس کے کہ یہ بجلی کسی زہرہ جبیں کے خرمنِ ناز پر گرتی مرزا کے نانا نے ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی دختر اور نواب احمد بخش خاں والئی فیروز پور جھرکہ جاگیردار لوہارو کی بھتیجی امراؤ بیگم سے کر دی اور

۱۸۱۳ء میں مرزا نے اپنے آبائی وطن آگرہ کو خیر باد کہہ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ دہلی ہر چند کہ اجڑ چکی تھی مگر اس کے باوجود وہ علم و ادب کا گہوارہ اور تہذیب و تمدن کا مرکز تھی۔ اس نقل مکانی سے مرزا کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا۔ یہاں کے ارباب علم و فضل سے ملاقات کی راہیں استوار ہوئیں اور ان تعلقات سے مرزا کو گوناگوں علمی و اخلاقی فوائد حاصل ہوئے۔

پنشن

مرزا کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ کی وفات کے بعد نواب احمد بخش والئی فیروز پور جھرکہ نے مرزا کے خاندان کیلئے انگریزوں سے پنشن مقرر کرادی تھی جس کی ادائیگی ریاست فیروز پور جھرکہ کے خزانہ سے کیجاتی تھی۔ جب تک مرزا صغیر سن رہے پنشن میں کام چلتا رہا مگر شادی ہو جانے کے بعد اخراجات میں اضافہ ہوگیا اور مرزا مقروض ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ موصوف نے اپنی پنشن کے اضافہ کیلئے سولہ سال تک مختلف سطحوں پر جدوجہد کی حد یہ ہے کہ کلکتہ تک کا سفر اختیار کیا جب بھی بات نہ بنی تو بالآخر ملکہ انگلستان کی خدمت میں اپیل دائر کی لیکن شومئی قسمت وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس سب جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا کی باقی تمام عمر اس قرضہ کی ادائیگی میں کٹ گئی جو انہوں نے دلی کے مہاجنوں سے اس مقدمہ بازی کے سلسلہ میں لیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ مرزا نے زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ہمت نہ ہاری۔ یہ شعر مرزا کی ناکامیوں کا عکاس ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ   ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

شاہی ملازمت:

مرزا چونکہ انتہائی مالی مشکلات میں گرفتار ہو چکے تھے اس لئے دوستوں کے مشورہ پر قلعہ معلّٰی کی ملازمت پر آمادہ ہو گئے۔ ۱۸۵۰ء میں حکیم احسن اللہ خاں مدار المہام اور مولانا نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب کی سفارش پر بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفر نے مرزا کو خلعتِ فاخرہ

اور نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب عطا کیا اور خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔ پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ اس زمانے میں تمام ملازمین کو ہر ششماہی کے بعد تنخواہ ادا کی جاتی تھی۔ مگر مرزا اس انتظار کے متحمل نہ ہو سکے لہٰذا جنوری ۱۸۵۱ء میں موصوف نے ایک منظوم درخواست پیش کی جس کا مضمون یہ تھا۔

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا   آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ   تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار

لہٰذا اس خوبصورت گزارش پر انہیں تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی جس کا سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔ ۱۸۵۴ء میں مرزا فخر الدین ولی عہد سلطنت مغلیہ غالب کے شاگرد ہو گئے اور چار سو روپے سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ اسی زمانے میں واجد علی شاہ کی سرکار سے پانچ سو روپیہ وظیفہ مقرر ہوا۔ بڑے زمانے کے بعد مرزا کی زندگی میں خوشی کا ایک جھونکا آیا تھا لیکن فلک کج رفتار سے یہ بھی نہیں دیکھا گیا۔ لال قلعہ ویران ہو گیا۔ جس عظیم ہستی نے مرزا کو خلعت فاخرہ اور خطاب سے نوازا تھا۔ اس نیک سیرت بادشاہ کو۔ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار کو۔ وارث تخت وتاج کو۔ غداری کے الزام میں خود اپنے ملک سے نکلتے اور رنگون میں پابند سلاسل ہوتے دیکھا۔ شہزادوں کے سرتن سے بریدہ ہوتے دیکھے اور مرزا خون کے آنسو بہاتے رہ گئے۔

دسمبر ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں نے دلی فتح کر لی تو انگریزی فوج شہر کے گلی کوچوں میں گھس گئی، لوگوں کی پکڑ دھکڑ اور لوٹ مار شروع کر دی۔ بدقسمتی سے مرزا بھی ایک گورے کے ہاتھ آ گئے اس نے مرزا کو جب اپنے افسر اعلیٰ کی خدمت میں پیش کیا تو اس نے دریافت کیا ''ویل مرزا تم مسلمان ہو'' مرزا نے جواب دیا آدھا مسلمان ہوں وہ مسکرایا اور کہا '' یہ آدھا مسلمان کیا ہوتا ہے'' مرزا نے عرض کیا سرکار شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔ کرنل ہنسا اور مرزا کو چھوڑ دیا۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا مگر اب جب مرزا کے مسلمان ہونیکا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو آئیے لگے ہاتھ یہ بھی دیکھ لیں کہ مرزا کو مذہب سے کتنا لگاؤ تھا۔ ایک موقع پر مرزا نے خود فرمایا ساری عمر ایک دن بھی نماز

پڑھی ہو تو کافر اور ایک دن بھی شراب نہ پی ہو تو گنہگار۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریزوں نے مجھے کیوں مسلمان سمجھا۔ غالباً یہی وہ خیالات ہیں جنکی وجہ سے وہ ساری عمر اتباع شریعت سے کوسوں دور رہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی جنہوں نے مرزا کو بہت قریب سے دیکھا فرماتے ہیں یہ سچ ہے کہ مرزا مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے مگر مذہب کی قبا۔ ان کے جسم نازک پر کبھی موزوں نہ ہو سکی۔ تشکیک کا جذبہ رہ رہ کر انکی زندگی کی گہرائیوں سے ابھرتا رہا۔ یہ شعر انکے افکار پریشاں کی عکاسی کرتے ہیں۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ۔۔۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد ۔۔۔ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

البتہ ان کا مذہبی رجحان فقہ اثنائے عشری کی جانب تھا۔ مرزا اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے آزاد منش، آرام طلب، بلکہ عیش پسند واقع ہوئے تھے۔ پھر بادہ نوشی انکا محبوب مشغلہ تھا بلکہ یوں کہیے کہ شراب اور بُھنا گوشت انکی زندگی کے لازمی اجزا تھے جس کے لئے مالی وسائل کی بہتات درکار تھی جو انہیں میسر نہیں تھے۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ موصوف کی زندگی محرومیوں اور ناکامیوں کی آماجگاہ بنتی چلی گئی، جسکا اظہار ان کے کلام میں جگہ جگہ ہوا ہے مثلاً

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا ۔۔۔ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ۔۔۔ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب کی مذہب سے بے نیازی یا بیزاری کا اندازہ اس بات سے کر لیجئے کہ ایک موقع پر موصوف نے میر مہدی مجروح کو مشورہ دیا تھا کہ اگر کوئی شخص آدمی بنا چاہے تو منطق اور فلسفہ پڑھے۔ قرآن اور فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ (نعوذ باللہ) مرزا کی تمام عمر مالی مشکلات کا شکار رہی۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ بیشک مرزا مذہبی آدمی تو نہیں تھے لیکن اچھے انسان ضرور تھے۔ کسی کو دکھ درد میں دیکھ کر ان کے اندر کا انسان

تڑپ اٹھتا، اور وہ مالی مشکلات کے باوجود جو کچھ ممکن ہوتا اس کو پیش کر دیتے کبھی سائل کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے۔ مرزا بلا کے وضعدار، خلیق اور بامروت آدمی تھے۔ تعصب کی لعنت سے بہت دور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم یعنی ہندو انکے بڑے مداحوں میں شامل تھے۔ اسی طرح شعر کے معاملہ میں بڑے صاف ذہن اور کھلے دل کے مالک تھے۔ اچھا شعر کسی کا بھی ہوتا داد دیئے بغیر نہیں رہتے۔ جب انھوں نے مومن کا یہ شعر سنا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو بہت تعریف کی اور کہا کاش مومن میرا سارا دیوان مجھ سے لے لیتا اور یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔ ایک محفل میں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے اور وجد کرتے رہے:

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں   اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

ایک دن مرزا شطرنج کھیل رہے تھے منشی غلام علی خاں نے کسی کو سنانے کے لئے ذوق کا شعر پڑھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے   مر کے بھی نہ چین پایا تو کدھر جائیں گے

مرزا کے کان میں اسکی بھنک پڑی تو شطرنج چھوڑ کر فوراً بولے بھیا تم نے یہ کیا پڑھا۔ خان کہتے ہیں کہ میں نے وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے۔ میں نے کہا ذوق کا۔ یہ سنکر بہت متعجب ہوئے اور مجھ سے بار بار اس شعر کو پڑھواتے اور سر دھنتے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب شعر کے معاملہ میں تعصب سے بالا، حق گو اور انصاف پسند تھے۔

مرزا نام و نمود اور شہرت کے عاشق تھے۔ انکا جوہر ذاتی۔ نیز شعر گوئی کا منفرد اسلوب اس امر کا بجا طور پر متقاضی تھا کہ موصوف کو غیر معمولی شہرت اور بلند مقام حاصل ہو۔ لیکن شومئی قسمت کہ انکی زندگی میں انکو یہ مقام اس حد تک حاصل نہیں ہو سکا جس کے وہ مستحق یا اہل تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کے بعد مرزا کا شاہی تزک و احترام۔ خلعت فاخرہ۔ خطاب اور لگی بندھی آمدنی سب داستان پارینہ بن کر رہ گئے۔ جوں جوں انگریزوں کے قدم دلی میں جمتے

گئے وہاں کے رئیسوں اور نوابوں کا اقتدار سمٹتا گیا۔ انکی دولت جواب دینے لگی۔ بڑی بڑی جائیدادیں اور حویلیاں ہندو مہاجنوں کے پاس رہن رکھی جانے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ادبی سرگرمیاں اور شعری نشستیں جو مشرقی تہذیب و معاشرت کا ایک حصہ تھیں مفقود ہو گئیں اور مرزا کی مالی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔

ریاست رامپور سے وظیفہ:

چنانچہ مرزا غالب نے امید وبیم کے عالم میں نواب یوسف علی خاں والئی رامپور کو ایک خط لکھا جس میں اپنے وظیفہ کے اجراء کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی اور مبلغ یک صد روپیہ ماہوار کا وظیفہ مستقل طور پر جاری کر دیا گیا جو مرزا کو تادم حیات ملتا رہا۔ ۱۸۶۰ء میں نواب صاحب کی دعوت پر مرزا رامپور تشریف لے گئے جہاں انکی بڑی عزت افزائی کی گئی اور ان کے اعزاز میں نواب صاحب کے محل میں ایک نہایت عالیشان مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔ نواب صاحب نے مرزا کے کلام سے متاثر ہو کر کوشش کی اور مرزا کی پنشن اسی سال دوبارہ جاری ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ تین سال کی رکی ہوئی پنشن بھی یکمشت مل گئی۔ جب پنشن مل گئی تو مرزا نے خلعت کی بحالی کیلئے کوشش کی اور ۱۸۶۳ء میں مرزا کی یہ آرزو بھی پوری ہو گئی۔

وفات:

جوانی کی بے اعتدالیوں اور شراب نوشی نے مرزا کی صحت بالکل تباہ کر دی تھی اور وہ ۱۸۶۶ء سے تقریباً خانہ نشین ہو کر رہ گئے تھے۔ دوست احباب کے ہاں بھی جانا بند کر دیا تھا۔ جو آجاتا اس سے ملاقات کر لیتے۔ مرنے سے چند دن قبل ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ وفات سے ایک دن پیشتر دماغ پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ اسی عالم میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اپنے خالق حقیقی کی طرف مراجعت فرما گئے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں آف لوہارو نے مرزا کو اپنے خاندانی قبرستان بستی نظام الدین اولیاء نزد چونسٹھ کھمبا میں سپرد خاک کیا (کیونکہ مرزا اس خاندان کے داماد تھے) اس طرح ہندوستان کا یہ سر سبد گلشن شعر و ادب اور تاجدار اقلیم سخن۔ دلی کی

جنت نظیر سرزمین (جسے فلک کی سربلندی اور فرازی کا شرف حاصل تھا) آسودۂ خاک ہوگیا۔ لوح مزار پر میر مہدی مجروح کا قطعہ تاریخ آج بھی کندہ ہے: وقت کی شکست و ریخت نے مرزا کے مزار کو کافی بوسیدہ کردیا تھا مگر خدا غریق رحمت کرے حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کو جنہوں نے مزار کی مرمت کرا کر ان کے نام کی تختی مرزا اسداللہ خاں غالب آویزاں کرادی تھی۔ راقم ۱۹۴۷ء میں ہجرت سے قبل جب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسرو کے مزارات پر حاضری کیلئے گیا تھا تو اس وقت غالب کے مزار پر بھی حاضر ہوا تھا۔ اب یہ مزار ایک خوبصورت مقبرہ کی شکل میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے جو ہندوستان کے ایک معروف فلمساز کی عنایت کا رہین منت ہے۔ جس نے مرزا غالب پر ایک خوبصورت فلم بنا کر انکی عظیم خدمات کا حق ادا کردیا۔

شاعری:

خواجہ الطاف حسین حالی غالب کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ مرزا نے ۱۸۰۹ء میں جب انکی عمر بارہ سال تھی تو اردو میں اور ۱۸۲۲ء میں یعنی تیرہ سال بعد فارسی زبان میں شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے اسدؔ اور پھر غالب تخلص اختیار کیا۔ غالب پر عام طور پر رات کو بادہ نوشی کے بعد جب سرخوشی کا عالم طاری ہوتا تو فکر سخن فرماتے۔ طریقہ کار یہ تھا کہ جب کوئی شعر وارد ہوتا یا مکمل ہو جاتا تو کمر بند میں گرہ لگایا کرتے۔ اس طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو جاتے۔ پھر صبح کو ناشتہ کے بعد یادداشت کا بندھن اور کمر بند کی گرہ کھولتے جاتے اور شعر صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے جاتے۔ مرزا نے جب شعر کہنا شروع کیا تو وہ انتہائی پُر آشوب دور تھا۔ سلطنت مغلیہ کا زوال اپنی آخری منزلوں کی طرف رواں دواں تھا اور فرنگیوں کی گرفت ہندوستان پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی تھی۔ مسلمانانِ ہند اگر ایک طرف انگریزوں کے زیر عتاب تھے تو دوسری طرف ہندو اکثریتی قوم کی چیرہ دستیوں کی زد میں تھے۔ پھر بدقسمتی سے مسلمان نہ صرف اقلیت تھے بلکہ ان کا تعلیمی معیار شرمندگی کی حد تک پست تھا۔ الغرض وہ اخلاقی، معاشرتی، سماجی اور سیاسی ہر اعتبار سے تباہی و بربادی کی طرف جارہے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے دلی کو فتح کرنے کے لئے جس

درندگی اور بربریت کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے۔ لال قلعہ کے باہر۔۔۔ پریڈ گراؤنڈ' جامع مسجد اور چاندنی چوک میں مسلمانوں کی نعشیں بکھری پڑی تھیں اور کوئی اٹھانے والا بھی نہیں تھا' غالب نے یہ دلخراش اور دل فگار مناظر بچشم خود دیکھے۔ ان خوں آشام اور خونچکاں کیفیات اور حالات کے اثرات کا ان کی شاعری پر مرتب ہونا ایک فطری امر تھا چنانچہ یہی ہوا کہ یہ شرر بار اور شعلہ فشاں آہیں جو اشعار کی شکل میں منہ سے نکلیں انہوں نے اپنے سوزِ دروں سے انسان تو انسان۔۔۔ پتھر کا کلیجہ شق کر کے رکھ دیا۔

غالب کے کلام کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں یکسانیت اور یک رنگی کے بجائے ناہمواری پائی جاتی ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ارتقائی منازل سے ہو کر گذری ہے۔ اگر وہ شروع سے آخر تک ایک وضع پر قائم رہتے تو یہ ناہمواری پیدا نہ ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے ابتدائی دور میں مختلف اساتذہ کی پیروی کی ہے جن میں بیدل' ناسخ' مومن اور میر تقی میر شامل ہیں۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا　　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب　　　عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

غالب نے بیدل کا اندازِ بیان پیدا کرنے کی کوشش تو بہت کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بیدلؔ کی پیروی کے بعد غالب نے ناسخ کی بھی تقلید کی مگر ان کا رنگ غالب کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا تھا' لہٰذا اس کو بھی ترک کرنا پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے مومنؔ کا اتباع کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو غزلیں ان کے رنگ میں لکھیں وہ نہایت خوبصورت اور بلند پایہ ہیں۔ مومن کے علاوہ غالب نے میرؔ سے بھی استفادہ کیا اور جو غزلیں خدائے سخن کے رنگ میں کہیں وہ بلاشبہ سہل ممتنع اور لاجواب ہیں۔ غالب کے دل میں حضرت میرؔ کی جس قدر عظمت تھی اس کا اندازہ اس شعر سے کیا جا سکتا ہے کہ

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ　　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

دوسری چیز جو غالب کے کلام میں شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں کچھ اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جو معلق اور پیچیدہ ہیں جن میں نہ شعریت ہے اور نہ معنویت' قافیہ ردیف اور وزن کی پابندی کرتے ہوئے الفاظ کا طلسم باندھ کر شعر کا ڈھانچہ کھڑا کر دیا گیا ہے' مگر وہ اشعار نہایت بے جان ہیں جن میں کاوش بسیار کے بعد بھی خیال آفرینی کا فقدان نظر آتا ہے۔۔۔ بلکہ سچ پوچھیں تو دل یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ یہ اشعار غالب کے ہیں۔ مگر بہر حال یہ غالب کے دیوان میں موجود ہیں' مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا　　　آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا　　　خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

غالب ذہین بھی تھے' خوددار اور غیور بھی۔ یا تو ان اساتذہ کی پیروی سے بات بنی نہیں یا پھر یوں کہیئے کہ ان اسالیب کو غالب کی جدت اور دشوار پسند طبیعت نے قبول نہیں کیا۔ بہر حال جب شعور پختہ ہوا۔ تو اپنے کلام کے نقائص خود ہی دور کیے اور اپنی بالغ نظری' مشقِ سخن اور جودت طبع سے کام لیکر خود اپنی راہ متعین کی اور ایک ایسا دلکش اور منفرد اسلوب اختیار کیا جس نے انہیں واقعی غالب بنا دیا۔ انہیں یوں تو ہر صنفِ سخن پر مکمل دسترس اور قدرت حاصل تھی مگر موصوف نے اپنی جدت طراز اور دشوار پسند جولانی طبع کیلئے غزل کو جو صدیوں سے مشرقی اقدار کی امین اور مقبول صنفِ سخن رہی ہے نہ صرف اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا بلکہ اس کی قدیم روایات کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے معنی آفرینی اور ندرتِ تخیل سے ایسا نکھارا اور سر بلند کیا کہ ہمدوشِ ثریا کر دیا۔ ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ یوں تو غالب کے کلام میں بہت سی خصوصیات ہیں مگر سب سے بڑی خصوصیت جس پر ان کی شاعرانہ عظمت کا قصر تعمیر ہوا ہے وہ ان کا ''انداز بیان'' ہے مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے　　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب　　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

یہ الگ بات ہے کہ کسی نے اس انداز بیان کو "طرز ادا" کسی نے "جدت طرازی" اور کسی نے "حسن بیان" سے تعبیر کیا مگر اس انداز بیان میں حسنِ زبان و بیان، تراکیب، خیالات، محاکات، تشبیہات، استعارات اور کنایات غرضکہ جملہ لوازمات شاعری شامل ہیں اور اسی انداز جدت طرازی پر ارباب نظر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ جو بات غالب کے کلام میں ہے وہ کسی اور شاعر کے یہاں نہیں۔

شوخی وظرافت:

غالب کے کلام میں ایک اور کمال یہ ہے کہ وہ ہر شخص کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتا ہے۔ اگر آپ شوخی وظرافت کے دلدادہ ہیں تو آپ کو اس کے کلام میں ایسے منہ بولتے اور مسکراتے ہوئے اشعار بھی ملیں گے جن میں خیال آفرینی اور ظرافت کی پھل جھڑیاں چھٹتی نظر آئیں گی، مثلاً یہ اشعار:

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی　　سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام　　ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

اگر آپ شراب و شباب کی رنگین اور گلپوش وادیوں سے حسن و عشق کے حسین اور دلفریب نظاروں سے لطف اندوز ہونا چاہیں تو اشعار کے آئینوں میں سرخوشی اور کیف و مستی کے ایسے جلوہ ہائے رنگیں بھی آپ کو ملیں گے کہ آپ کا دل خوشی سے جھوم اٹھے گا مثلاً

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو　　آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

اگر آپ کو کائنات کے رازہائے سربستہ کی پردہ کشائی مطلوب ہے تو یہ پختہ کار شاعر

آپ کو عرش بالا کے ایسے مقامات کی سیر کرائے گا جہاں عالم کون ومکاں کی ہر شے صاف نظر آئے گی۔ مگر غالب کی یہ ایک خاص ادا ہے کہ وہ بات کو کھل کر صاف بیان نہیں کرتے بلکہ پردوں میں' اشاروں اور کنایوں کا سہارا لیکر ادا کرتے ہیں جس سے بظاہر شعر کو سمجھنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے مگر اس سے بات کا حسن اور نکھر جاتا ہے' ملاحظہ فرمائیے:

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا ۔۔۔۔ جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

(برق حسن کنایہ ہے ذات باری تعالیٰ کیلئے ۔۔۔۔ اسی طرح جوش بہار کنایہ ہے ظہور عالم کیلئے)

جدت طرازی اور محاکات:

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں ۔۔۔۔ تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

مرتا ہوں اس آواز پہ ہرچند سر اڑ جائے ۔۔۔۔ جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر ۔۔۔۔ کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

انسانی نفسیات:

انسانی نفسیات کا تجزیہ اس حسین اور دلکش انداز میں کیا گیا ہے کہ زندگی کی پیچیدہ گرہیں کھلتی اور رخ حیات کے مخفی پہلو اجاگر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج ۔۔۔۔ مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج ۔۔۔۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

خیال آفرینی:

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد ۔۔۔۔ مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے ۔۔۔۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

حقیقت نگاری:

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

رشک کی جلوہ ریزیاں:

غالب نے رشک کے پامال موضوع کو اپنی نازک خیالیوں اور جدت طرازیوں سے جو شرف بخشا ہے اس پر اہل نظر حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

واردات حسن و عشق:

غالب نے شاید ہی حسن و عشق کی کسی کیفیت کو نظر انداز کیا ہو، ان کی غزل کیا ہے ایک نگار خانہ ہے، دو اشعار ملاحظہ فرمائیے:

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

فلسفیانہ مسائل:

غالب نے غزل کو فلسفیانہ مسائل سے روشناس کیا۔ فلسفہ اور تفکر کو غزل کے سانچہ میں ڈھال کر غزل کو نئی راہ دکھائی۔ اسی وجہ سے غالب کو پہلا فلسفی شاعر کہا گیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا   قیامت ہے سرشک آلود ہونا تیری مژگاں کا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب   تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

رمزیہ انداز:

رمزیہ انداز دراصل ایک لطیف کنایہ ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کے لئے وہ مناسب اور مخصوص الفاظ استعمال نہیں کرتا بلکہ ایک مختلف پیرائے اور مختلف انداز سے اس مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ مثلاً یہ شعر

نقش فریادی ہے کس کی شوخئ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یہ شعر جو مطلع دیوان غالب ہے بلاشک وشبہ غالب کی شوخی فکر کا آئینہ دار ہے جس میں سرتاپا کنایوں سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً نقش کنایہ ہے (برائے مخلوقات) اسی طرح شوخی تحریر بھی کنایہ ہے (برائے خالقِ حقیقی) کاغذی پیرہن پھر کنایہ ہے (برائے فریادی) جو کاغذ کے لباس میں پیکر تصویر کی طرح (مدعی کی صورت میں حاضر ہے)۔ دراصل ایک زمانے میں ایران میں یہ دستور تھا کہ اگر کسی شخص پر کوئی ظلم یا زیادتی ہوتی تو وہ کاغذ کا لباس زیب تن کر کے حاکم کے سامنے پیش ہوتا تھا کہ وہ اس فریادی کی طرف (جو کاغذی لباس میں موجود ہے) فوراً اپنی توجہ مبذول کرا سکے۔

ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے   آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس شعر میں شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ عشق ایک لاعلاج مرض ہے مگر اس نے اس خیال کو استفہام کے پردہ میں ادا کیا ہے' یہاں شاعری کا کمال اس رمزیہ اندازِ بیان میں پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری رقمطراز ہیں کہ غالب کا کلام سرتاپا رمزیت کے لباس میں جلوہ گر ہے اور یہ ان کے آرٹ کا وہ پہلو ہے جس کے نظر انداز کردینے سے ان کی قدرت فکر کے تمام محاسن ملیامیٹ

ہو جاتے ہیں۔ رمز و کنایہ کے اوصاف سے متعلق دو تین اشعار اور ملاحظہ فرمائیے:

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۔۔۔ پھر ترا وقت سفر یاد آیا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ۔۔۔ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی ۔۔۔ بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

جدت طرازی:

جدت طرازی کے شوق نے غالب کو نئے الفاظ نئی تراکیب نئی بندشیں اور زبان کے نئے سانچے وضع کرنے پر مائل کیا۔ یوں بھی غزل کی زبان ان کے خیالات عالیہ کے اظہار کیلئے کافی نہیں تھی جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے:۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل ۔۔۔ کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

اس ضرورت نے بھی انہیں میدان شاعری کو وسیع کرنے پر راغب کیا اور نتیجہ ان تازہ کاریوں کا یوں نکلا کہ اردو زبان کا دامن جواہرات سے مالا مال ہو گیا یہی وجہ ہے کہ تمام نقادان فن اس بات پر متفق ہیں کہ غالب نے زبان کو وسعت دی۔

مثلاً یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیے تشنۂ فریاد، شہر آرزو، وادیٔ خیال، دریا آشنا، فردوس گوش، جنت نگاہ، دعوت مژگاں، دعوت تمنا، آئینہ انتظار وغیرہ وغیرہ

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک ۔۔۔ میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود ۔۔۔ قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

معنی آفرینی:

غالب کے خیال میں شاعری نام ہی معنی آفرینی کا ہے نہ کہ قافیہ پیمائی کا۔ اسی لئے موصوف قافیہ پیمائی نہیں کرتے پہلے مضمون کی رعایت سے ایسے الفاظ تلاش کرتے ہیں جو ابہام و متضاد معنی کے حامل ہوں۔ پھر مضمون آفرینی کرتے ہیں یعنی ابہام پر عمارت شعری تعمیر کرتے ہیں

اور پھر آخر اس مطلوبہ مضمون کو شعر کے حسین سانچہ میں ڈھال دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

بوئے گل، نالہ دل، دودِ چراغ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اس شعر میں غالب نے لفظ پریشاں پر شعر کی عمارت استوار کی ہے یعنی ابہام سے مضمون پیدا کیا غالب نے یہ شعری خوبی لفظ پریشان سے پیدا کی ہے کیونکہ بوئے گل نالۂ دل اور دود چراغ کی خاصیت بھی یہی ہے کہ وہ منتشر ہو جاتی ہے پریشان ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک اور شعر:

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

"غالب کی غزل میں تغزل ہے معنویت ہے وسعت وتاثیر ہے گیرائی ہے گہرائی ہے معنی آفرینی اور ندرت تخیل ہے تمام شعری محاسن اور فنی باریکیوں سے مزین ہے۔ وہ شعر نہیں کہتا، جگر میں تیر اس کج ادائی کے ساتھ پیوست کرتا ہے کہ جگر کے پار نہیں ہوتا" بلکہ قاری خلش کی لذت سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے، بار بار پڑھتا اور سر دھنتا ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ اس نے غزل کو جو صدیوں سے مشرقی اقدار کی امین اور مقبول صنف سخن رہی ہے، اس کی قدیم روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے معنی آفرینی اور ندرت تخیل سے ایسا نکھارا کہ حریف گردش دوراں بنا دیا، اور غزل کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ عرصہ دراز تک اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکا پھر طویل عرصہ بعد فانی حسرت، اصغر جگر اقبال اور فیض نے غزل میں عصر حاضر کا رنگ بھرا اور اس کو اس مقام پر لے آئے جہاں آج کا شاعر غزل کہتا اور پڑھتا ہے۔

حکیمانہ تفکر اور شاعرانہ تخیل:

غالب نے حکیمانہ تفکر اور شاعرانہ تخیل دونوں کو یکجا کر کے کلام میں غیر معمولی دلکشی اور دل نشینی پیدا کی ہے تفکر سے کلام میں گہرائی اور تخیل سے شعریت پیدا ہوتی ہے اگر تفکر میں تغزل کا رنگ شامل نہ کیا جاتا تو شعر روکھا پھیکا بلکہ بیجان ہو جاتا۔ یہ خوبصورت اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

میں نے سوچا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں　　وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ایجاز:

دریا کو کوزے میں بند کرنے کا نام ایجاز ہے، غالب کے یہاں اکثر ایسے اشعار ملتے ہیں جن کے دو مصرعوں میں معانی کی ایک دنیا آباد ہے، غالب کو خود بھی اس خصوصیت کا احساس تھا۔ فرماتے ہیں

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے　　جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے　　اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن　　بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تری عادت ہی سہی

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب　　دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا　　اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام　　قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقت سفر یاد آیا

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی　　جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

زیر نظر مضمون میں آپ نے غالب کے کلام کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں۔ غالب کا بیشتر کلام حسن و عشق کی جلوہ ریزیوں اور نفسیات کی الجھنوں کیساتھ ساتھ اس پر آشوب اور زوال پذیر معاشرہ کا عکاس ہے جس میں انسانیت شرافت اور اخلاقی اقدار تیزی سے مٹتی جارہی تھیں فنا ہوتی جارہی تھیں۔ جبر و استبداد ناانصافیاں اور معاشرتی ناہمواریاں بڑھتی جارہی تھیں۔ غالب خود بھی اس دار و گیر کا ہدف بنے مگر انہوں نے شکست تسلیم نہیں کی۔ بلکہ مردانہ وار مقابلہ کیا اور تمام عمر خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہے۔

اگر ہم برصغیر کی ادبی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ دو تین صدیوں میں بڑے بڑے قابل فخر اور مایہ ناز شعراء کرام پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے فکر و فن سے دنیائے شعر و سخن کو مالا مال کیا اور آنے والی نسلوں کیلئے گرانقدر سرمایۂ ادب چھوڑا مگر ان میں چار شعراء ایسے عظیم اور ممتاز ہیں جو آج بھی دنیائے ادب پر چھائے ہوئے ہیں اور انکی شاعرانہ عظمت کا ڈنکا آج بھی بج رہا ہے۔ ان میں میر تقی میر، مرزا غالب، مرزا داغ دہلوی اور شاعر مشرق علامہ اقبال شامل ہیں۔ اس لئے کہ اہل علم اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کیلئے اکثر و بیشتر ان میں سے کسی بھی شاعر کے اشعار کا سہارا لیکر اپنا خیال اپنا مفہوم اور اپنی بات ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر ان میں غالب کا نام سرفہرست ہے اور ان کے اشعار زیادہ زبان زد خاص و عام ہیں اور یہی غالب کی شاعرانہ عظمت آفاقیت اور مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔

ڈاکٹر غلام شبیر رانا

الطاف حسین حالؔی: بہ حیثیت نقّاد

الطاف حسین حالؔی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴) نے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اپنی تخلیقی اور تنقیدی تحریروں سے اُردو ادب کو موضوعاتی تنوع سے آشنا کیا۔ زمانی اعتبار سے تو محمد حسین آزادؔ کو اُردو تنقید میں اولیت حاصل ہے۔ حالؔی سے چھبیس برس قبل آزاد نے اُردو میں تنقیدی مباحث کا آغاز کر دیا تھا۔ حالؔی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' لکھ کر اُردو تنقید کا باضابطہ آغاز کیا۔ حالؔی کے تنقیدی خیالات ان کی تصانیف سے ملتے ہیں۔ انہوں نے مقدمہ شعر و شاعری' یادگار غالب اور حیات جاوید میں اپنے تنقیدی خیالات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ حالؔی نے تحریر کے نیچرل' سلیس اور حقیقت پسندانہ ہونے پر زور دیا ہے۔ اردو میں نظری اور عملی تنقید کے سلسلے میں حالؔی نے اہم خدمات انجام دیں۔ حالؔی نے مثنوی' قصیدہ اور غزل کے فنی پہلوؤں پر فکر انگیز اور خیال پرور مباحث کا آغاز کر کے اُردو تنقید کے لیے میدانِ عمل کا انتخاب کیا۔

حالؔی نے اپنے تنقیدی تصورات سے اردو تنقید کو ایک سمت عطا کی۔ اُردو شاعری کے بارے میں حالؔی کے خیالات کا پرتو ان کے کلام میں بھی جلوہ گر ہے:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر مَلَک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

افلاطون نے بھی یہ واضح کر دیا تھا کہ شاعری کے ذریعے صحیح علم کا حصول ممکن نہیں اور انسانی اخلاق کو شاعری سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ افلاطون نے شاعروں کی جذباتیت کی بنا پر یہ کہا تھا کہ اُن میں اخلاقی تنظیم کا فقدان ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے حالؔی نے افلاطون سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے — عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے

تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے — مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے

گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے — جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

حالی نے اس بات پر زور دیا کہ تخلیق ادب میں مقصدیت کا خیال رکھنا چاہیے۔ شاعری قومی تاریخ اور تہذیب پر دوررس اثرات مرتب کرتی ہے۔ افراد کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کا شاعری سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ حالی نے شاعری کے اوصاف، شاعری کی ماہیت اور تخلیق فن کے لمحوں میں شاعر کی ذمہ داریوں سے بحث کرتے ہوئے تخلیق کار کے منصب کا بھی تعین کیا ہے۔ حالی کی عملی تنقید کا یہ پہلو اہم ہے کہ اس نے اصناف شعروادب کے تجزیاتی مطالعہ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ادب پارے کے محاسن اور معائب کا جائزہ لینے کے بعد یہ ضروری ہے کہ معائب کی اصلاح پر توجہ دی جائے۔ حالی نے اصناف نثر مثلاً سوانح نگاری کے بارے میں بھی تنقیدی خیالات پیش کیے ہیں۔ ان خیالات کی روشنی میں تخلیق کار کے انداز بیان اور اسلوب کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ حالی نے علی گڑھ تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے انگریزی ادب کی اہمیت کو تسلیم کیا مگر انگریزی زبان پر کامل دسترس نہ ہونے کی وجہ سے وہ انگریزی تنقید کے اعلیٰ معیار کو روبہ عمل لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ حالی نے انگریزی زبان کے بلند پایہ نقادوں پر توجہ نہیں دی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے حالی کی تنقید کے بارے میں لکھا ہے:

> ''خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط، یہ تھی حالی کی کل کائنات۔''(۱)

ظاہر ہے پروفیسر کلیم الدین احمد کا یہ انداز فکر تنقید کے بجائے احتساب کا مظہر ہے۔ اُردو تنقید کے ارتقائی مراحل کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کڑے معیار کی توقع بلاجواز ہے۔

۱۔ کلیم الدین احمد: اردو تنقید پر ایک نظر، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، پہلی بار ۱۹۶۵ء، صفحہ ۱۰۹

کلیم الدین احمد جو اُردو میں تنقید کو اقلیدس کا خیالی نقطہ اور معشوق کی موہوم کمر سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے اس قدر سخت فیصلہ غیر متوقع نہیں، وہ حالی کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

''حالی اردو تنقید کے بانی بھی ہیں اور اس وقت تک اردو کے بہترین نقاد بھی۔''

حالی کو اُردو کا بہترین نقاد قرار دے کر کلیم الدین احمد نے حالی کی تنقید پر ایک اور وار کیا ہے۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ حالی کے تنقیدی نظریات اقلیدس کے خیالی نقطے کی عمدہ مثال قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کے خیال میں حالی کی تنقید معشوق کی موہوم کمر کی مثال ہے جس کو سراب کی حیثیت حاصل ہے۔ کلیم الدین احمد کے انتہا پسندانہ خیالات سے قطع نظر یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار ہے کہ حالی نے اپنی تجزیاتی تحریروں سے افکار تازہ کے وسیلے سے جہانِ تازہ تک رسائی کے امکانات پیدا کیے۔ حالی نے اردو ادب میں تخلیق کار کو بلند پروازی پر آمادہ کیا اور تخلیق کار کو اس تاب و تواں سے روشناس کرایا جس کو بروئے کار لا کر حرف صداقت لکھنے کا حوصلہ نصیب ہوتا ہے۔ شاہین کو ممولے سے ممیز کرنے میں مدد ملتی ہے اور تحریر عصری آگہی کے اعجاز سے روح میں اتر جانے والی اثر آفرینی سے لبریز نظر آتی ہے۔ حالی نے واضح کر دیا کہ اگر کلام نیچرل ہو، سادگی اور سلاست سے مزین ہو اور حقیقت نگاری اور صداقت نگاری کو ملحوظ رکھا گیا ہو تو تخلیق فن کے لمحوں میں ایک فعال تخلیق کار خون بن کر رگِ سنگ میں اتر جاتا ہے۔ حالی کے تنقیدی خیالات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ شاعری اور معاشرے کے بارے ایک حقیقی انداز فکر پروان چڑھانے کے متمنی تھے۔ حالی نے اپنی تنقید میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شاعری سوسائٹی سے گہرے اثرات قبول کرتی ہے۔ معاشرتی انتشار اور ابتری کا ماحول شاعری کے لیے ہلاکت خیزی کا پیغام لاتا ہے۔ حالی نے جہالت، توہم پرستی اور تقلید کی روش پر نکتہ چینی کی۔ حالی کی اہم تنقیدی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔ حالی اور ورڈز ورتھ دونوں نے اپنے کلام کے دیباچے تحریر کیے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ان دیباچوں کی تنقیدی اہمیت آج بھی مسلمہ ہے۔ حالی نے شاعری کے بارے میں مقدمہ لکھا ہے:

"بعض لوگوں نے شعر کو میجک لینٹرن سے تشبیہہ دی ہے۔ یعنی میجک لینٹرن جس قدر زیادہ تاریک کمرے میں روشن کی جاتی ہے اس قدر زیادہ جلوے دکھاتی ہے" (۲)

حالی کا خیال ہے کہ اگر شاعری کا معیار پست ہو تو معاشرے اور ادب پر بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ زندگی کی اقدار عالیہ کو ضعف پہنچتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر تخلیق کار حرف صداقت لکھنا بھول جائیں اور مبالغہ آمیزی کو شعار بنالیں تو قومی کردار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ ادب کے عام قاری فطرت کے برعکس (un natural) باتوں کے سرابوں میں بھٹک جاتے ہیں۔ حالی نے شاعری کی اہمیت وافادیت کو اُجاگر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ شاعری کو بہتر انداز میں پیش کیا جائے تاکہ یہ ید بیضا کا معجزہ دکھا سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شاعری کا ملکہ بیکار نہیں...... شاعری کوئی اکتسابی چیز نہیں بلکہ بعض طبقوں میں اس کی استعداد خداداد ہوتی ہے۔ پس جو شخص اس عطیہ الٰہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا۔ ممکن نہیں کہ اس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے" (۳)

حالی کا تعلق ایک ایسے نظام فکر سے تھا جس نے ذہن وذکاوت اور تخلیقی عمل کو مقصدیت کی راہ پر گامزن کر دیا تھا۔ سرسید تحریک کا اثر حالی کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ حالی نے شاعری کے تخلیقی عمل کے لیے طبع کی موزونیت کو بنیادی اہمیت کا حامل عنصر قرار دیا۔ ذوق سلیم کو پروان چڑھانے کے سلسلے میں حالی ادب عالیہ کے مطالعہ کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ حالی نے تخلیق ادب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ الفاظ ومحاورات کا انتخاب اس طرح کیا جائے کہ خاص وعام دونوں طبقے اس کے مفہوم کو سمجھ سکیں۔ روزمرہ کی زبان سے انحراف کا مطلب یہ ہوگا کہ زبان سادگی سے محروم ہوتی چلی جائے گی۔

۲۔ الطاف حسین حالی: مقدمہ شعروشاعری، سٹار بک ڈپو لاہور، ۱۹۶۵ء صفحہ ۸

۳۔ الطاف حسین حالی: مقدمہ شعروشاعری، سٹار بک ڈپو لاہور، ۱۹۶۵ء صفحہ ۹

حالی نے شاعری کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس جانب توجہ دلائی ہے کہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی میں شاعری نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ہر دور میں شعرا کو مقبولیت حاصل رہی ہے۔ شاعر اگر اخلاق کو ملحوظ رکھے تو شاعری شائستگی کا حسین مرقع نظر آتی ہے۔ شاعری کی اخلاقیات کے حوالے سے اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے حالی نے لکھا ہے:

> ''شعر اگرچہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین و تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں'' (۴)

حالی کے تنقیدی خیالات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ تخلیق کار کو اخلاق اور اخلاص کا پیکر دیکھنے کے آرزومند تھے۔ خلوص، دردمندی، انسانی ہمدردی اور اخلاق کی بدولت حریتِ فکر کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور منافقت کا قلع قمع کرنے میں مدد ملتی ہے۔ سانت بیو نے لکھا ہے:

> ''نظام خیال اور فن میں عظمت اور دائمی شہرت کا راز یہ ہے کہ یہاں ریاکاری داخل نہ ہونے پائے۔ اسی بات میں انسانی ہستی کے رفیع الشان حصے کی ناقابل تسخیر عظمت کا راز پوشیدہ ہے'' (۵)

وہ تخلیق کار جو حق وصداقت کی ترجمانی کو اپنا مطمح نظر بنالیتا ہے وہ علائق دنیوی سے بے تعلق ہوجاتا ہے۔ اس کا دل مہر و وفا کا باب بن جاتا ہے۔ وہ حریم کبریا کے آشنا کی حیثیت سے ہر درد کی دوا بن کر میدان عمل میں آتا ہے تاہم وہ قحط الرجال کے دور میں معاشرتی انحطاط کے مسموم اثرات کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے:

> ''جس قدر سوسائٹی کے خیالات، اس کی رائیں، اس کی عادتیں، اس کی رغبتیں، اس کا میلان و مذاق بدلتا ہے، اسی قدر شعر کی حالت بدلتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی بالکل بے ارادہ معلوم ہوتی ہے'' (۶)

۴۔ الطاف حسین حالی: مقدمہ شعر وشاعری، ص ۲۰

۵۔ جمیل جالبی ڈاکٹر: ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، اشاعت اول ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۱

۶۔ الطاف حسین حالی: مقدمہ شعر وشاعری، ص ۲۱

ایک بلند پایہ تخلیقی فن پارہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب اس میں حسن کا عنصر جلوہ گر ہو۔حالی نے ملٹن سے متاثر ہو کر شعر میں سادگی، اصلیت اور جوش کو ناگزیر قرار دیا۔ملٹن نے تو تین الفاظ (simple, passionate, sensuous) استعمال کیے مگر حالی نے سوائے Simple کے باقی دو الفاظ کا صحیح ترجمہ نہیں کیا۔

اگر شاعری میں زندگی کی اقدار عالیہ کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو شاعری بُرائی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔بُری شاعری سے زبان و ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔زبان تہذیبی ابتری کا نمونہ پیش کرتی ہے اور زبان میں ابتذال اور رکاکت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔نامہذب اور فحش الفاظ کی بھرمار ذوق سلیم پر گراں گزرتی ہے۔اس مسموم ماحول میں شاعری پر کیا گزرتی ہے اور قومی کردار پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اس بارے میں حالی نے لکھا ہے:

> ''شاعری کو ابتداً سوسائٹی کا مذاق فاسد بگاڑتا ہے، مگر شاعری جب بگڑ جاتی ہے تو اس کی زہریلی ہوا سوسائٹی کو بھی نہایت سخت نقصان پہنچاتی ہے اور جھوٹی شاعری کا رواج تمام قوم میں ہو جاتا ہے''(۷)

حالی نے تخلیقی ادب کے دقوفی پہلوؤں کی جانب متوجہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ تخلیق کار کو مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہئے۔دبستان سرسید کا اہم رکن ہونے کی حیثیت سے حالی نے شاعروں کو مشورہ دیا کہ جہاں تک ممکن ہو حق گوئی اور بے باکی کو اپنایا جائے۔حالی نے دروغ، مبالغہ آرائی، بہتان طرازی، دشنام گوئی، افتراء، خوشامد اور منافقت کو تخلیق کار کے منصب کے خلاف قرار دیا۔ہمارے تخلیق کار کا المیہ یہ رہا ہے کہ وہ خودستائی اور تعلی کا شکار ہے ایسا طرز احساس شاعری کو گمراہ کن بنا دیتا ہے۔حالی کا خیال ہے کہ دل میں کسی بات کی چبھن پیدا ہو جائے تو قوت متخیلہ میں خود بخود اس کے بارے میں مضامین غیب سے آنا شروع ہو جاتے ہیں اور صریر خامہ نوائے سروش بن جاتی ہے۔

---

(۷) الطاف حسین حالی: مقدمہ شعر و شاعری، ص ۲۹

شاعری کی اصلاح دراصل معاشرتی اصلاح کو یقینی بنا دیتی ہے۔اگر شاعری زندگی کی حیات آفریں اقدار کی ترجمان نہ ہوتو اسکی اصلاح ناگزیر ہے۔حالی نے شاعری کی اصلاح کے بارے میں اپنے خیالات نہایت واضح انداز میں پیش کیے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

"جہاں تک ممکن ہو،اس کے عمدہ نمونے پبلک میں شائع کیے جائیں۔
اس طرح یہ بھی ضروری ہے کہ شعر کی حقیقت اور شاعر بننے کے لیے جو شرطیں درکار ہیں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے۔"(۸)

حالی کے تنقیدی خیالات نے اذہان کی تطہیر وتنویر کا اہتمام کیا۔حالی کے مالِ نایاب پر توجہ وقت کا اہم تقاضا ہے۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر   شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

---

(۸) الطاف حسین حالی: مقدمہ شعر و شاعری، ص ۳۳

ڈاکٹر محمد معز الدین

ڈاکٹر عندلیب شادانی بہ حیثیت محقق

اردو ادب کی نثری تاریخ وارتقاء میں صنفی لحاظ سے تحقیق وتنقید دو متوازی اصناف نثر ہیں۔ درحقیقت یہ دو ہمزاد بہنوں کی مانند ہیں۔ کسی بھی ادبی فن پارے میں تحقیقی موادنہ ہو تو یہ تحریر نیم پخت اور کھوکھلی نظر آتی ہے۔ تحقیق کے بغیر تنقید کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔

ڈاکٹر شادانی کے یہاں تحقیقی مضامین میں تنقیدی شعور کا خوشنما پرتو ہے۔ زبان کی شیرینی کے ساتھ طنز ومزاح کی لطافت اور ان کا منفرد انداز بیان قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور وہ حد درجہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ قُدما میں اُردو فارسی کے ممتاز انشاء پرداز محمد حسین آزاد کا یہی رنگ تھا۔ ان کی خوبصورت انشاء پردازی تحقیقی چاشنی اور بسا اوقات مبالغہ آمیزی نے پڑھنے والوں کو مدتوں مسحور کیے رکھا۔

ان کے بعد مولانا شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالؔی کا دور آیا۔ حالؔی کی تنقیدی بصیرت بالخصوص مقدمہ شعر وشاعری اردو انگریزی ادب کے مطالعہ اور اثر پذیری کے تناظر میں اپنے زمانے میں مولانا شبلی سے زیادہ نمایاں ہے۔ مولانا شبلی تحقیقی میدان میں حالی سے چند قدم آگے ہیں وہ ایک مورّخ تھے اور انہیں اسلامی تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ ڈاکٹر شادانی کی بھی تاریخ پر گہری نظر تھی۔ ان کا اوّل باضابطہ تحقیقی مقالہ انگریزی زبان میں مغلیہ تاریخ سے متعلق تھا۔ اس کی اساس فارسی کی دو مشہور کتابوں ''تاج الماثر'' اور ''طبقات ناصری'' پر تھی۔ زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ان کا یہ مقالہ ہنوز زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے تاریخ کے دو اساتذہ ڈاکٹر حبیب اللہ، پروفیسر شعبۂ تاریخ اسلام اور ڈاکٹر عبدالحلیم صدر شعبۂ تاریخ نے اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں جب لندن گئے تو اس مقالے سے استفادہ کیا تھا۔ اب یہ دونوں اللہ کو

پیارے ہوگئے ہیں۔مرحومین نے ان کتابوں کی تاریخی اہمیت اور ڈاکٹر شادانی کی تحقیق کی تحسین کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے دور کی تاریخ مرتب کرتے وقت ایک مؤرخ ان کتابوں کو نظر انداز نہیں کرسکتا جوان حکمرانوں کے عہد میں فارسی میں لکھی گئیں ان کتابوں کی زبان مُسجّع اور مُقفّیٰ ہونے کے سبب سریع الفہم نہیں۔ڈاکٹر شادانی نے اپنے مقالے میں ان دونوں اہم فارسی مخطوطوں کی نہایت دیدہ ریزی سے کام لیکر وضاحت کردی ہے۔اس تحقیقی مقالے پر لندن یونیورسٹی سے ۱۹۳۴ء میں آپ کو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری عطا کی گئی ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہء اُردو فارسی کی ایک ہونہار طالبہ کلثوم ابوبشر نے جو ڈھاکہ یونیورسٹی کے اسی شعبے میں پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئیں۔"ڈاکٹر عندلیب۔۔حیات اور کارنامے" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ممبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔یہ مقالہ شائع ہوگیا ہے۔

یوں تو اُردو کے تحقیقی میدان میں جو ادباء مشہور ہوئے ان میں بابائے اردو مولوی عبدالحق حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر حامد حسن قادری، امتیاز علی عرشی، حبیب الرحمٰن شیروانی' قاضی عبدالودود' ڈاکٹر عندلیب شادانی وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص طور سے سامنے آتے ہیں۔"جدید اردو تنقید" کے مصنف شارب ردولوی کی رائے میں اُردو دنیا میں سب سے زیادہ محتاط محقق قاضی عبدالودود ہیں ان کی تحقیق کو خالص تحقیق کا نام دیا جاسکتا ہے۔انہوں نے ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے اور ان میں تحقیقی ذوق و جستجو پیدا کیا، جدید اردو تنقید میں ایک نام ڈاکٹر عندلیب شادانی کا بھی اضافہ کرتا ہوں۔قاضی عبدالودود شادانی صاحب کے گہرے دوست تھے۔تحقیق میں دونوں کا نقطۂ نظر ایک تھا۔دونوں لندن میں ساتھ تھے اور دونوں نے لندن کے برٹش میوزیم، لندن یونیورسٹی کی اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز کی لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری میں بے شمار مخطوطوں اور کتابوں کا مطالعہ کرکے اردو میں سائنٹفک تحقیق کی بنیاد رکھی۔قاضی عبدالودود نے لندن میں تقریباً دس سال رہ کر اردو اور فارسی مخطوطوں کو کھنگال ڈالا۔بہت

کچھ سرمایہ جو دراصل ہندوستان سے ہی منتقل ہوا تھا لندن میں چھوڑ آئے۔ اب بھی وہاں بہت کچھ ہے بقول اقبال

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں ہزار بادۂ ناخوردہ دررگِ تاک است

قاضی صاحب غالبؔ پر پھر بھی اتھارٹی سمجھے جاتے تھے ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر وہ دلی میں غالب کمیٹی کے سیکرٹری جنرل تھے۔ ڈھاکے میں وہ ڈاکٹر شادانی سے ملنے اور اردو کے شعبہ اردو اور فارسی کے ممتحن کی حیثیت سے تشریف لاتے۔ اس طرح دونوں کی ملاقات اور تحقیقی مواد پر بھی سیر حاصل گفتگو ہوتی۔ میری قاضی صاحب سے پٹنے میں بھی ملاقاتیں ہوتیں، میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقابلے کے لئے انہی کی تجویز پر قائم چاندپوری پر تحقیقی کام ڈاکٹر شادانی کی نگرانی میں شروع کیا اردو تحقیق میں قاضی صاحب ایک ریاضی داں کی طرح ہر نکتے کی باریکی پرکھتے اور تحقیقی مواد پر ڈاکٹر شادانی سے تبادلہ خیال کرتے۔ اردو میں ڈاکٹر شادانی کے تحقیقی مضامین پر مبنی ان کی دو کتابیں ''تحقیقات'' اور ''تحقیق کی روشنی میں'' ہیں۔ آخرالذکر پر رائٹرس گلڈ کی طرف سے داؤد انعام بھی ملا۔ ''تحقیقات''، تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے اس میں سترہ مقالات ہیں جن میں دو مضامین ''التتمش'' اور ''رضیہ'' تاریخی نوعیت کے ہیں۔ ان مضامین کے حوالے سے اس دور میں ان کے زورِ قلم کا خاص چرچا تھا۔

علامہ رضا علی وحشت کلکتوی اپنے ایک خط بنام ڈاکٹر عندلیب شادانی میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''میری درخواست'' پر آپ نے ''تحقیقات'' کا ایک نسخہ عطا فرمایا ہے۔ اس کا مطالعہ میرے لئے سیر چمن سا پر لطف ہوا میں نے صرف لطف ہی حاصل نہیں کیا بلکہ استفادہ بھی'' ڈاکٹر صاحب کی ان کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق و تنقید میں ان کا مقام کتنا بلند ہے۔ ''تحقیق کی روشنی میں'' ڈاکٹر عندلیب شادانی کے اکیس مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کے تقریباً تمام مقالے پاک و ہند کے مؤقر جرائد میں شائع ہو کر قارئین سے داد و تحسین لے چکے ہیں۔ تمام مضامین

نمبر ۱۔ ''مہر نیم روز'' کراچی ستمبر ۱۹۵۸ء

جامع، مدلل اور بصیرت افروز ہیں۔

اس کتاب کے مضامین کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول تو ایسے مضامین جو نسبتاً طویل ہیں اور جن میں تحقیق و تنقید کا حسین امتزاج ہے۔ جیسے شیفتہ ایک نقاد کی حیثیت سے، مواد ہیت اور اسلوب، محبوب کیلئے فعل مذکر کا استعمال حالی اور پیروی مغربی اور ادب میں عریانی اور فحاشی اور لکھنوی شاعری کی چند خصوصیتیں۔ دوسری قسم ان مضامین کی ہے جنھیں ہم خالصاً تحقیقی کہہ سکتے ہیں جیسے "ریختی کا موجد، خان اور ان کا دیوان" "گلشن نو بہار" "مخزن فوائد، دیوان جہاں۔ تیسری قسم وہ ہے جن میں زبان و بیان، قواعد عروض اور تحقیقی اور لسانی اغلاط کی نشاندہی اور اصلاح کی گئی ہے۔ فہرست مضامین ہی پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر شادانی کا دائرۂ فکر کتنا وسیع اور متنوع ہے۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان اغلاط کی اصلاح کرنے والے محقق ہمارے درمیان اب کتنے ہیں۔ غالب کی "پنج آہنگ" کی اغلاط۔ علامہ نیاز فتح پوری، علامہ ماجد اور علامہ سیماؔب کی گرفت کرنے والا کتنا بالغ نظر محقق اور مستند ذی علم ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں ان کا طرز بیان طنزیہ اور استہزائی نہیں جیسا کہ ان کی کتاب دور حاضر اور اردو غزل گوئی اور "تحقیقات" کے بیشتر مضامین میں تھا۔

"تحقیق کی روشنی میں" تحقیق و تنقید دونوں ہم آغوش ہو کر تخلیق کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر شیفتہ ایک نقاد کی حیثیت سے مواد، ہیت اور اسلوب ریختی کا موجد، اور ادب میں فحاشی اور عریانی، جیسے مذکورہ مضامین کا مطالعہ کافی ہوگا۔ شیفتہ کی انتقادی صلاحیت اور سخن فہمی کا کچھ ایسا رعب تھا کہ ہر شخص بڑا نقاد اور سخن فہم تسلیم کرتا تھا۔ "گلشن بیخار" ان کا تذکرہ بہ زبان فارسی ہے۔ اس میں قائم چاند پوری کی رباعیوں اور قطعات کی شیفتہ نے بڑی تعریف کی ہے۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ وہ ایسے زیادہ تعریف کے قابل نہیں زیادہ تر ان میں الفاظ کے ہیر پھیر اور تلازمے سے مضمون پیدا کئے گئے ہیں۔ میں بھی قائم چاند پوری پر اپنے مقالے کے دوران ان قطعات اور رباعیات پر کچھ اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ ڈاکٹر شادانی نے یہ مضمون لکھ کر قارئین

ادب کو ایک مغالطے سے بچالیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب جس موضوع پر قلم اٹھاتے اتنی چھان بین اور محنت کرتے کہ بحث کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے اس پر مستزاد منطق و استدلال سے بھری ہوئی ان کی دلاویز زبان شیفتہ نے اپنے تذکرے میں غالب کی جو تعریف کی ہے، ڈاکٹر شادانی نے اپنی تحقیق میں اس کا پول کھول دیا ہے۔ اور اب شیفتہ اور غالب کے متعلق ایسی جرأت مندانہ باتیں کہنے والا کون ہے۔ غالب کا بحیثیت شاعر کتنا بھی بلند مقام ہو ایک انسان کی حیثیت سے ان کا درجہ ہرگز بلند نہیں داغ کے والد نواب شمس الدین خاں کے خلاف انگریزوں سے مخبری کر کے ''جنگ آزادی'' کے بعد انہیں پھانسی پر چڑھوانے والا انسان ہرگز بلند کردار نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے غالب اور ان کے ممدوح شیفتہ کے اصل خدوخال کی نقاب کشائی کی ہے۔ اپنے مضمون ''دیوان جہاں'' میں ڈاکٹر صاحب نے ''ارباب نثر اردو'' کے مصنف سید محمد صاحب کی ان اغلاط کی اصلاح کی ہے جو مصنف مذکور سے ''دیوان جہاں'' کے سلسلے میں سرزد ہوئی ہیں۔ ان سے دیوان جہاں کی تاریخ تالیف مؤلف کا نام اور تخلص، باپ کا نام، وطن وغیرہ سب میں سہو سرزد ہوا ہے۔ انہیں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ والے قلمی نسخے کا علم نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی نسخے کے حوالے سے ان اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔ دیوان جہاں کے اس نسخے کو پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم نے چھپوا دیا تھا کلیم صاحب نے دیوان جہاں کے مصنف بینی نرائن کی مختصر سوانح حیات دادین میں دیدی ہے اور قوسین میں ''کریم'' لکھ دیا ہے۔ غالباً کریم سے مراد مولوی کریم الدین مولف تذکرۂ طبقات شعرائے ہند سے ہے یہ تذکرہ کمیاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ رام پور لائبریری میں ہے۔ مولوی سید محمد کی جن جن اغلاط کی طرف ڈاکٹر صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ تمام اس میں موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ''ارباب نثر اردو'' کے مصنف سید محمد صاحب نے مولوی کریم ہی کے اس تذکرے سے یہ عبارت نقل کی ہے مگر اپنا ماخذ نہیں بتایا۔ بہر حال یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ خود مولوی کریم کا ماخذ کیا ہے' کیونکہ یہ تذکرہ مولوی کریم اور ڈاکٹر فیلن کی متحدہ کاوش کا نتیجہ ہے۔

الغرض ڈاکٹر شادانی کی کتابیں، تحقیقات اور تحقیق کی روشنی میں ادبی مقالوں کا ایک ایسا صحیفہ ہے جسے بلاشبہ اردو ادب کے تحقیقی سرمائے میں ایک گرانقدر اضافہ کہیں گے۔ اس دور میں محقق بھی موجود ہیں اور بڑے بول والے نقاد بھی۔ انگریزی، فرانسیسی اور روسی ادب سے متاثر ہو کر لکھنے والے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اب یہ جماعت بھی ختم ہو رہی ہے جس کا یہ مسلک ہو کہ جدید دور کے مطالبات کو بھی پورا کیا جائے اور ماضی سے بھی ہمارا رشتہ نہ ٹوٹے۔ وہ جماعت بھی دم توڑ رہی ہے جس کی طرف ہم زبان کی اسناد کی قواعد و عروض کی اصلاح کیلئے نظر اٹھا سکیں۔ غلط قسم کی جدت پسندی اور جتہادی کاوش سے پاک ڈاکٹر صاحب کے سنجیدہ اور وقیع تحقیقی مقالے اور نگارشات ایک ایسی مثال ہے جو اس زمانے میں کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔

علاوہ ازیں زبان کے مبادیات اور ان سے انحراف جو آج کل نوجوان لکھنے والوں میں کارفرما ہے اس کو روکنے کیلئے یہ مضامین بہت ہی مفید ثابت ہونگے کیونکہ زبان و بیان، عروض و قوافی اور اصولِ قواعد سے لیکر ڈاکٹر شادانی نے اشعار کی نزاکتوں سے سیر حاصل بحث کی ہے اور تنقید و تحقیق کے قواعد و اصول کو منضبط کیا ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ہم عصر اور ان کے مداح پروفیسر مسلم عظیم آبادی مرحوم نے ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے، اسی پر میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

ادا شناسِ معانی ادیبِ لاثانی فروغِ شمعِ سخن عندلیب شادانی

سید انتخاب علی کمال

فن تاریخ گوئی پر یک صد مطبوعات و مخطوطات کا اشاریہ

(بارہویں صدی ہجری سے پندرہویں صدی ہجری تک)

فن تاریخ گوئی، شاعری کی صنائع بدائع سے مرصّع ایک مشکل اور منفرد صنف ہے جو اردو اور فارسی کے شعراء کے مجموعہ ہائے کلام، کلیات اور دواوین میں بکثرت ملتی ہے۔ دراصل قطعات تاریخ، ولادت، وفات، اشاعت کتب، اہم وقائع کی وقوع پذیری کو محفوظ رکھنے اور بیشتر متنازع امور کے لئے ادب میں ہمیشہ مستند و کار آمد سمجھے جاتے ہیں۔ قطعات تاریخ کی فنی ناطق شہادتیں بڑی وقیع ہوتی ہیں۔ فن تاریخ گوئی کی اسی اہمیت و افادیت کو برصغیر کے مستند محقق اور استاد پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاںؒ نے بھی تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "داخلی شہادت کے ذیل میں قطعات تاریخ مفید ہیں۔ ہمارے اکثر دواوین میں یہ صنف بھی ہے۔۔۔تاریخی اور معاشرتی معلومات کیلئے انکی افادیت مسلم ہے۔"[1]

لیکن المیہ یہ ہے کہ حسابِ جمل کے عام طور پر مروج نہ ہونے کی وجہ سے اسے ادق سمجھ کر عام طبیعتیں اس کی طرف کم مائل ہوتی ہیں۔ عام خیال یہ ہے اس فن پر کتب دستیاب نہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اگر تلاش صادق ہو تو بہت سی کتب ملتی ہیں۔ البتہ "بوطیقا" کی طرز کی کوئی کتاب نہیں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ "بوطیقا" کی طرز پر تو عام شاعری میں بھی کوئی کتاب نہیں نظر آتی۔

فن تاریخ گوئی کی کتب کا پہلا جائزہ جو زیر مطالعہ آیا وہ "لغات تاریخ نگاری" مرتبہ غلام حسین کسرٹی منہاس ہے۔ مگر یہ چند کتب کا جائزہ ہے۔ اس کے بعد "نگار" پاکستان کا "فن

---

[1] ماخوذ: "تنقید و تحقیق" از ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان۔ مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی

تاریخ گوئی نمبر' مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہے جس میں چالیس سے زائد کتب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ جائزہ تحقیقی اعتبار سے خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہی جائزہ سنگ میل پبلشرز لاہور نے ۱۹۸۴ء مطابق ۱۴۰۵ھ میں کتابی شکل میں شائع کیا۔ پھر اسی کو ۲۰۰۴ء مطابق ۱۴۲۵ھ میں الوقار پبلی کیشنز لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔ مگر اس میں کوئی تعلیقات نظر نہیں آئیں۔ جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ ۱۹۸۲ء سے ۲۰۰۴ء تک فن تاریخ گوئی پر کوئی کتاب ہی نہیں لکھی گئی۔ جبکہ اکتوبر/دسمبر ۲۰۰۴ء مطابق ۱۴۲۵ھ ہی میں سہ ماہی "الاقرباء" کے شمارہ نمبر ۴ میں محترم قمر رعینی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے آخری حصہ میں پچیس کتابوں کی ایک مختصر سی فہرست بھی دی ہے۔ ہر چند کہ یہ فہرست مختصر ہے مگر اس میں بعض ایسی کتب کے نام بھی دیئے گئے ہیں۔ جو اس سے قبل شائع ہونے یا مرتب کی جانے والی فہرستوں میں شامل نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے محترم قمر رعینی کی فہرست ممتاز تو ضرور ہے مگر بھر پور نہیں۔ لہٰذا یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ سہ ماہی الاقرباء کی وساطت سے فنِ تاریخ گوئی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نیز اس موضوع پر تحقیق کرنیوالے ریسرچ اسکالرز اپنی تحقیق و تدقیق کو مزید وسعت دے سکیں۔ یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے کہ میرا بوجوہ تمام مطبوعات ومخطوطات تک رسائی حاصل کرنا انتہائی دشوار ہے بلکہ قلمی مسودات جو مختلف شخصیات کے پاس ہیں ان تک رسائی تو میرے لئے تقریباً ناممکن ہی ہے۔ پھر بھی اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے بارھویں صدی ہجری سے پندرھویں صدی ہجری تک کی فہرست واشاریہ نذر قارئین ہے۔ اس اشاریہ کو ہم موضوع کے اعتبار سے تین اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(الف) مجموعہ ہائے قطعات تاریخ کی کتب (۶۷ مجموعے)

(ب) فن تاریخ گوئی کے اصول وقواعد، پیچیدہ مسائل، اعداد کے مساوی الفاظ واسماء، اور تاریخی ناموں کی کتابیں (۳۲ کتب)

(ج) تاریخ گوشعراء کے حالات زندگی مع نمونہ تاریخ پر مشتمل تذکرہ۔

ان تینوں اقسام کی کتابوں کے اس اشاریہ کو بعض وجوہات کی بناء پر مصنف دار یا حروف وار رکھنے کے بجائے سنہ وار رکھا جا رہا ہے۔ تاکہ قارئین اور محققین پر عیاں ہو سکے کہ کون سی کتاب سب سے پہلے لکھی گئی۔ اور کس دور میں سب سے زیادہ کتابیں فن تاریخ گوئی پر لکھی گئیں۔

(الف) مجموعہ ہائے قطعات تاریخ کی کتب:

(۱۱۰۱ھ سے ۱۲۰۰ھ) ۔ بارھویں صدی ہجری مطابق سترھویں صدی عیسوی

۱۔ گلزار فتح شاہ ہند: سنہ اشاعت ۱۱۱۱ ہجری مطابق ۱۶۹۹ عیسوی۔ از عبدالجلیل واسطی بلگرامی ابن امیر احمد اس مجموعے کا تاریخی نام "گلزار فتح شاہ ہند" ہے۔ جس سے ۱۱۱۱ ہجری نکلتے ہیں۔ اس کا دوسرا تاریخی نام "طوطی نامہ فیروزی شاہ عالمگیر" ہے۔ اس سے بھی ۱۱۱۱ ہجری ہی برآمد ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ فتح قلعہ ستارہ گڑھ کے موقع پر بہ عہد عالمگیری مرتب کیا گیا۔ اس کتاب کا ذکر میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی کتاب "سبحۃ المرجان" میں کیا ہے۔ اور اس کے حوالے سے صاحب "غرایب الجمل" (۱۳۱۷ فصلی سنہ)، (ولا حیدر آبادی) نے بھی نقل کیا ہے۔ (بحوالہ تذکرۂ درفشاں)

"گلزار فتح شاہ ہند" از عبدالجلیل واسطی بلگرامی کو قطعات تاریخ کا سب سے پہلا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۲۔ کلیات تاریخ: موسوم بہ "تواریخ بے بدل" از رائے سناتھ سنگھ بیدار۔ یہ ۸۸ صفحات کا قلمی نسخہ ہے۔ جو کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی میں محفوظ ہے۔ اس کا سنہ تخلیق نہیں ملتا البتہ رائے سناتھ سنگھ بیدار کی ولادت تقریباً ۱۱۲۱ ہجری مطابق ۱۷۰۹ عیسوی بتائی جاتی ہے۔ تذکرۂ شعرائے اردو مرتبہ میر حسن میں بیدار کا ذکر ملتا ہے۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کی تاریخ ولادت بیدار ہی کی کہی ہوئی ہے۔ بیدار صرف تاریخیں کہتے تھے۔ آپ کی کل تاریخیں "کلیات تاریخ" میں ہیں (بحوالہ تذکرۂ درفشاں)

(۱۲۰۱ ہجری تا ۱۳۰۰ ہجری) تیرھویں صدی ہجری مطابق اٹھارھویں صدی عیسوی

۳۔اشرف التواریخ: ۱۲۴۵ ہجری مطابق ۱۸۲۹ عیسوی ۔ مؤلفہ سید ابوظفر شریف احمد، شرافت نوشاہی ۔ کتاب کا نام "اشرف التواریخ" تاریخی نام ہے جس سے عیسوی سنہ ۱۸۲۹ برآمد ہوتا ہے ۔ ناشر شرافت نوشاہی ۔ سجادہ نشین، ساہن پال شریف ۔ ضلع گجرات (بھارت) یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے ۔ قطعات تاریخ کی کتاب ہے کتاب پر سنہ اشاعت درج نہیں ۔" (بحوالہ تذکرۂ درخشاں)

۴۔مُخبر الواصلین: ۱۲۴۹ ہجری مطابق ۱۸۳۳ عیسوی ۔ مرتبہ ابوعبداللہ محمد فاضل معروف مظہر الحق (مظہر اکبر آبادی) یہ کتاب ۱۲۴۹ ہجری میں کلکتہ سے چھپی ہے اس میں کل (۱۶۸) صفحات ہیں ۔ جن میں مؤلف نے حضور اکرمؐ کی وفات سے لیکر آئمہ کرام اور دیگر اہل اللہ کی وفات تک مختلف شعراء کے کہے ہوئے قطعات تاریخ جمع کیے ہیں" ۔ (بحوالہ نگار پاکستان "تاریخ گوئی نمبر")

۵۔شریف التواریخ: ۱۲۵۴ ہجری مطابق ۱۸۳۸ عیسوی ۔ از سید ابوظفر شریف احمد، شرافت نوشاہی کتاب کے نام "شریف التواریخ" سے ۱۸۳۸ عیسوی برآمد ہوتا ہے ۔ درگاہ عالیہ نوشہ گنج بخش ساہن پال ضلع گجرات (بھارت) سے شائع ہوئی ۔ کتاب پر سن طباعت درج نہیں ہے ۔ کتاب دو جلدوں میں ہے ۔ کتاب میں قطعات تاریخ ہیں" ۔ (بحوالہ تذکرۂ درفشاں)

۶۔خزینۃ الاصفیا: ۱۲۸۰ ہجری مطابق ۱۸۶۳ عیسوی ۔ از غلام سرور لاہوری ۔ "خزینۃ الاصفیا" سے ۱۲۸۰ ہجری نکلتے ہیں {یہ کتاب دراصل "مخبر الواصلین (مرتبہ مظہر اکبر آبادی) اور "تاریخ الکملا" مرتبہ حیرت پھلواری کی طرز کی کتاب ہے جس میں مختلف شخصیات کی وفات پر کہے ہوئے قطعات تاریخ جمع ہیں ۔ (بحوالہ تذکرۂ درفشاں)

۷۔کانِ تاریخ: ۱۲۸۲ ہجری مطابق ۱۸۶۵ عیسوی ۔ از رام پرشاد ۔ مطبع انوری ۔ آگرہ ۔ "کان تاریخ" تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۸۲ ہجری برآمد ہوتا ہے ۔ اس کتاب میں قطعات تاریخ کافی تعداد میں ہیں یہی وجہ ہے کہ اسکا شمار قطعات تاریخ کے مجموعوں میں کرنا پڑ رہا ہے ۔ ورنہ دراصل یہ ہم عدد الفاظ کا مجموعہ ہے ۔

۸۔ گنجینۂ سروری: ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ عیسوی۔ معروف بہ "گنج تاریخ" (۱۲۸۴ھ) نام مصنف مجہول۔ صاحب "نوشتۂ تاریخ" اعجاز جودھپوری نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر رسماً کیا ہے۔ جس میں مصنف کا نام اور نوعیت کتاب کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ راقم الحروف کا قیاس ہے کہ معروف شخصیات کی تاریخ ہائے وفات کے قطعات کا مجموعہ ہوگا۔ (ماخوذ نوشتۂ تاریخ)

۹۔ دیوان تواریخ: ۱۲۸۸ ہجری مطابق ۱۸۷۱ عیسوی۔ از آل محمد مارہروی۔ مطبع نور الانوار۔ آرہ (ہندستان) میں چھپوایا گیا۔ "دیوان تواریخ" تاریخی نام ہے جس سے بحساب ابجد ۱۲۸۸ ہجری نکلتے ہیں۔ یہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے کتب خانۂ خاص میں محفوظ ہے۔ جو آل محمد مارہروی ابن سید آل امام ساکن مارہرہ (یوپی) کی تاریخوں کا ضخیم مجموعہ ہے جس کو ردیف وار ترتیب دیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کے ایک حصے کا نام "دوائر خجستہ"[۱] (۱۲۸۹ ہجری) رکھ کر صنعت دائرہ میں ایک سو تیرہ دائروں سے مختلف مواقع پر تاریخیں کہی ہیں۔ "دیوان تواریخ" میں ایک مختصر مجموعہ "تواریخ عزا" (۱۲۹۵ ہجری) بھی ہے۔ جو صاحب دیوان تواریخ یعنی آل محمد مارہروی کی وفات پر کہی گئی تاریخوں کا مجموعہ ہے۔ جس کو آل محمد مارہروی کے برادر زادے سید عبدالجلیل مارہروی نے "دیوان تواریخ" میں شامل کیا ہے۔ (بحوالہ تذکرۂ درفشاں)

۱۰۔ سرودِ غیبی: ۱۲۹۲ ہجری مطابق ۱۸۷۵ عیسوی۔ از میر محمد علی جویا مرادآبادی۔ "سرود غیبی" تاریخی نام ہے جس سے (۱۲۹۲ ہجری) برآمد ہوتا ہے اس کا دوسرا نام "خیابان تاریخ" بھی ہے۔ جس سے عیسوی سنہ (۱۸۷۵) نکلتا ہے۔ اس میں جویا مرادآبادی کے (۴۴۷) قطعات تاریخ ہیں۔ یہ کتاب فن تاریخ گوئی کا نادر شاہکار ہے جو ۱۲۹۸ ہجری مطابق ۱۸۸۱ عیسوی میں مطبع نول کشور لکھنؤ۔ انڈیا سے چھپی ہے۔ اس میں (۱۳۴) صفحات ہیں کتاب کے ابتدائی اوراق میں اس فن کے اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (بحوالہ تذکرۂ درفشاں، نگار کا تاریخ گوئی نمبر)

۱۱۔ ارمغان: ۱۲۹۲ ہجری مطابق ۱۸۷۵ عیسوی۔ تالیف مرزا محمد جعفر ابن مرزا دبیر لکھنوی۔

---

[۱] یہاں آل محمد مارہروی نے آج سے تقریباً ایک سو اڑتیس سال قبل "دوائر" کے عدد (۲۴۱) لئے ہیں۔ یعنی "دوائر" کے ہمزہ کو "ی" کا قائم مقام مان کر دس عدد لئے ہیں۔ یہی اصول جمہور ہے جو تاریخ گو شاعروں کے لئے قابل تقلید ہے۔ (صاحب مضمون)

کتاب کا نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۹۲ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ (ماخوذ تذکرہ درفشاں بحوالہ غرایب الجمل)

۱۲۔ قیصری عیشستان ہندوستان: ۱۲۹۴ ہجری مطابق ۱۸۷۷ عیسوی۔ از خواجہ محمد مرتضیٰ خاں بقا۔ اس کتاب کا تاریخی نام "قیصری عیشستانِ ہندوستان" ہے جس سے عیسوی سنہ (۱۸۷۷ء) برآمد ہوتا ہے۔ مطبع منشی نول کشور۔ کانپور۔ ہندوستان۔ اس مجموعے میں بہ عہد لارڈ لٹن گورنر جنرل ہند۔ دربار قیصری۔ دہلی (۱۸۷۷ء مطابق ۱۲۹۴ھ کے موقع پر کہی ہوئی تاریخیں ہیں۔ نیز سرورق پر بہت سے تاریخی فقرے درج ہیں۔ اس کتاب کا ذکر صرف تذکرہ درفشاں کے مؤلف نے کیا ہے۔

۱۳۔ کنز تواریخ: ۱۲۹۴ ہجری مطابق ۱۸۷۷ عیسوی کتاب کے مصنف یا مؤلف کا نام اور دیگر تفصیلات دستیاب نہیں۔ اس کتاب کے لئے ہمارا ماخذ صرف "نوشتۂ تاریخ ہے" جس میں صاحب نوشتۂ تاریخ نے صرف کتاب کا نام لکھا ہے۔ شاید معروف شخصیات کی تاریخ وفات کے قطعات ہوں۔ واللہ علم بالصواب۔

۱۴۔ تواریخ عزّا: ۱۲۹۵ ہجری مطابق ۱۸۷۸ عیسوی۔ از حافظ سید عبدالجلیل مارہردی۔ اس مجموعے میں صاحب دیوان تواریخ، آل محمد مارہردی کی وفات پر حافظ الجلیل مارہروی کی کہی ہوئی تاریخیں ہیں۔ یہ مجموعہ دیوان تواریخ کے ساتھ چھاپا گیا مگر یہ علیحدہ مجموعۂ قطعات تاریخ ہے۔ اسی لئے علیحدہ مجموعے کا درجہ دیا ہے (بحوالہ تذکرہ درفشاں)

۱۵۔ گلشنِ خیال: ۱۲۹۷ ہجری مطابق ۱۸۷۹ عیسوی۔ از محمد سعید۔ مطبوعہ حیدر آباد دکن (ہندوستان)۔ (بحوالہ نگار پاکستان۔ تاریخ گوئی نمبر)

۱۶۔ مَوادُ التواریخ: ۱۲۹۹ ہجری مطابق ۱۸۸۱ عیسوی۔ از الحاج حسین آقا نجوائی۔ کتاب کا نام بظاہر تاریخ کا حامل لگتا ہے۔ کیونکہ "موادُ التواریخ" سے بحساب ابجد ۱۲۹۹ اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہم نے اسے ۱۲۹۹ھ کی کتاب سمجھا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مقالہ نگار نے دیگر

تفصیلات درج نہیں کیں۔ ناشر کا نام اور سنِ اشاعت بھی نہیں لکھا۔ البتہ سہ ماہی مجلّہ "دانش" کے شمارے ۶۲۔۶۸ میں مطبوعہ آقائی محمد حسین تسبیح کے مضمون کا حوالہ ضرور لکھا ہوا ہے۔

(۱۳۰۱ ہجری تا ۱۴۰۰ ہجری) چودھویں ہجری مطابق انیسویں صدی عیسوی بیسویں صدی عیسوی

۱۷۔ تاریخ کملا: ۱۳۰۲ ہجری مطابق ۱۸۸۴ عیسوی۔ مرتب کا نام مجہول۔ یہ کتاب قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ لیکن صاحبِ "نوشتۂ تاریخ" نے اس کتاب کے بارے میں کچھ اور نہیں لکھا۔ کاش! وہ اس کی پوری معلومات لکھ دیتے۔ (بحوالہ نوشتۂ تاریخ)

۱۸۔ تواریخ اکمل: ۱۳۰۸ ہجری مطابق ۱۸۹۰ عیسوی۔ از محمد شاہ عرف فقیر محمد فدا۔ مطبوعہ بمبئی۔ انڈیا۔ تواریخ اکمل سے ۱۳۰۸ ہجری بر آمد ہوتے ہیں۔ دیگر تفصیلات دستیاب نہیں۔ (بحوالہ نگار پاکستان۔ تاریخ گوئی نمبر)

۱۹۔ بیان التواریخ: ۱۳۱۱ ہجری مطابق ۱۸۹۳ عیسوی۔ مُصنف کا نام مجہول۔ ناشر نامعلوم۔ البتہ "بیان التواریخ" سے ۱۳۱۱ ہجری بر آمد ہوتے ہیں۔ (بحوالہ تذکرہ درفشاں)

۲۰۔ آخرتِ باقی: ۱۳۱۴ ہجری مطابق ۱۸۹۶ عیسوی۔ از کھنولال تائب۔ مطبوعہ محمود نگر۔ لکھنؤ۔ ہندوستان "آخرتِ باقی" سے ۱۳۱۴ھ نکلتے ہیں۔ یہی سنِ اشاعت ہے۔ (بحوالہ نگار پاکستان۔ تاریخ گوئی نمبر)

۲۱۔ تواریخ میلادِ پاک: ۱۳۲۵ ہجری مطابق ۱۹۰۷ عیسوی۔ از اصغر حسین نامی۔ مطبوعہ حیدر آباد۔ دکن۔ انڈیا یہ قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ ہے نام تاریخی ہے۔ (بحوالہ نگار تاریخ گوئی نمبر۔ تذکرہ درفشاں)

۲۲۔ عز التواریخ: ۱۳۲۶ ہجری مطابق ۱۹۰۸ عیسوی از اصغر حسین۔ مطبوعہ حیدر آباد۔ دکن انڈیا۔ یہ بھی قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ ہے۔ "عز التواریخ" سے ۱۳۲۶ ہجری نکلتا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر

فرمان فتح پوری نے سالِ اشاعت ۱۳۲۵ھ تحریر کیا ہے۔ (بحوالہ تاریخ گوئی نمبر نگار)

۲۳۔ قطعاتِ تاریخ ورباعیات: ۱۳۲۹ ہجری مطابق ۱۹۱۱ عیسوی۔ از سید احمد افسر۔ مطبوعہ ۱۳۲۹ھ ناشر و مقام اشاعت دستیاب نہیں۔ تاریخی قطعات ورباعیات کا مجموعہ ہے۔ (بحوالہ نگار۔ تذکرۂ درفشاں)

۲۴۔ اعجاز التواریخ: ۱۳۳۰ ہجری مطابق ۱۹۱۱ عیسوی۔ از شرافت نوشاہی۔ مطبوعہ ساہن پال شریف۔ گجرات۔ پنجاب۔ انڈیا۔ "اعجاز التواریخ" سے ۱۳۳۰ ہجری نکلتا ہے۔ یہ تاریخی قطعات کا مجموعہ ہے۔ جو اپنی مثال آپ ہے۔ اور فنِ تاریخ گوئی کا نادر نمونہ ہے۔ (بحوالہ تذکرۂ درفشاں)

۲۵۔ تواریخ مہین: ۱۳۳۲ ہجری مطابق ۱۹۱۳ عیسوی۔ مرتبہ حکیم سید محمد مہدی متخلص بہ کمالؔ لکھنوی ابن جلال لکھنوی۔ یہ چھپن صفحات کی کتاب ہے۔ جو بڑے سائز پر مطبع تصویرِ عالم لکھنؤ۔ ہندوستان سے ۱۳۳۲ ہجری میں شائع ہوئی۔ "تواریخ مہین" سے ۱۳۳۲ھ نکلتا ہے اس کے علاوہ کتاب کا غیر تاریخی نام "آیات کمال" ہے۔ اس کتاب میں کئی معروف اور اہم شعراء کے قطعاتِ تاریخ وفات مل جاتے ہیں۔ مثلاً داغؔ دہلوی۔ نفیس لکھنوی امیر مینائی۔ صغیر بگرامی وغیرہ۔ (بحوالہ نگار پاکستان۔ تاریخ گوئی نمبر")

۲۶۔ تاریخ الکملا:

۱۳۳۳ ہجری مطابق ۱۹۱۴ عیسوی۔ از مولوی شاہ احمد کبیر، حیرتؔ پھلواروی۔ اس ضخیم کتاب کی دو جلدیں۔ پہلی جلد میں ۵۶۸ صفحات ہیں اور سنہ ۹۶۵ھ تک فوت شدگان کی تاریخیں ہیں۔ دوسری جلد میں ۳۴۲ صفحات ہیں اور ۱۳۱۲ ہجری تک فوت شدگان کے تاریخی قطعات ہیں۔ اہم دستاویزی کتاب ہے۔ یہ "مخبر الواصلین" (از مظہر اکبر آبادی) اور "خزینۃ الاصفیا" (از غلام سرور لاہوری) کی طرز کی کتاب ہے۔ (بحوالہ تذکرہ درفشاں)

۲۷۔اکمل التواریخ: ۱۳۳۹ ہجری مطابق ۱۹۲۰ عیسوی۔ از محمد یعقوب، ضیاء القادری بدایونی (ولادت ۱۸۸۳ء بدایوں (انڈیا) وفات ۱۹۷۰ء کراچی) یہ ضیاء القادری بدایونی کے قطعات کا مجموعہ ہے۔ کتاب کا نام تاریخی ہے۔ مؤلف ''دبستانوں کا دبستان کراچی'' نے کتابِ ہذا کو ایک اہم کتاب بیان کیا ہے۔ (بحوالہ دبستانوں کا دبستان کراچی)

۲۸۔گلزار ہمیشہ بہار: سنہ اشاعت نامعلوم۔ از محی الدین حسین خان تسلیم۔ مطبوعہ نظام المطابع حیدر آباد۔ دکن۔ (بحوالہ نگار پاکستان)

۲۹۔حسابِ جمل در شعری فارسی: سنہ اشاعت۔ کتاب کے مصنف کا نام۔ ناشر کا نام وغیرہ نامعلوم۔ (بحوالہ: مقالہ ''فن تاریخ گوئی...... تحقیق و جستجو'' مطبوعہ سہ ماہی الاقرباء)

۳۰۔معیار التواریخ: ۱۳۴۲ ہجری مطابق ۱۹۲۳ عیسوی۔ تالیف محمد جعفر علیخان۔ ریاض المومنین پریس۔ کاظمین۔ لکھنؤ۔ انڈیا۔ سے شائع ہوئی ہے۔

۳۱۔گنجینۂ تاریخ: ۱۳۴۹ ہجری مطابق ۱۹۳۰ عیسوی۔ از علامہ شفق رضوی حماد پوری۔ آزاد پریس ڈالی گنج۔ لکھنؤ۔ ہندوستان۔ ۱۳۴۹ ہجری میں طبع ہوئی۔ (بحوالہ مضمون قطعات تاریخ وفات شعراء مطبوعہ دو ماہی رسالہ ''برہان'' دہلی مجریہ جنوری فروری ۱۹۹۹ء) صاحب مضمون ڈاکٹر عبدالرؤف خان۔ اودی ءکلاں (راجستھان) نے کتاب کا سن طباعت ۱۳۴۹ ہجری اور کتاب کا نام ''گنجینۂ تواریخ'' اپنے مضمون میں کئی جگہ تحریر کیا ہے۔ جبکہ ''گنجینۂ تواریخ'' سے ۱۳۵۵ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ اور ''گنجینۂ تاریخ'' سے ۱۳۴۹ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ سن اشاعت بھی ۱۳۴۹ ہجری ہے۔ لہٰذا درست نام ''گنجینۂ تاریخ'' ہی ہو سکتا ہے۔

۳۲۔تاریخوں کے پھول: ۱۳۴۹ ہجری مطابق ۱۹۳۰ عیسوی۔ از اسد اللہ حُسینی۔ یہ منظوم گلہائے عقیدت کا مجموعہ ہے جو ۱۳۴۹ ہجری میں شمس المطابع۔ حیدر آباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں کل اٹھاسی (۸۸) صفحات ہیں۔ دیباچے میں فنِ تاریخ گوئی پر چند صفحات

لکھے ہیں۔باقی صفحات پر قطعاتِ تاریخ ہیں۔(بحوالہ نگار۔تاریخی گوئی نمبر)

۳۳۔شاہد غم: ۱۳۵۰ ہجری مطابق ۱۹۱۳ عیسوی۔مرتبہ سید انور علی شاؔد جے پوری۔یہ حضرت مرزا تقی بیگ مائل دہلوی ثم جے پوری (ولادت ۱۸۵۲ء دہلی۔وفات ۱۹۱۳ء جے پور) کی وفات پر مختلف شعراء کے کہے ہوئے تعزیتی قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ [۱] ہے۔جس کو راقم الحروف کے جد امجد شاؔد جے پوری نے اس منفرد انداز سے ترتیب دیا ہے کہ مرتب کی جانب سے نثر میں بھی جو کچھ تحریر کیا گیا ہے۔ان تمام نثری عبارات۔فقرات اور جملوں سے سالِ وفاتِ مائلؔ دہلوی برآمد ہوتا ہے۔اسطرح یہ مجموعہ فنِ تاریخ گوئی کا منفرد شاہکار بن جاتا ہے۔جو جے پور (راجستھان) انڈیا سے شائع ہوا اس میں مختلف شعراء کے ایک سوتہتر (۱۷۳) قطعاتِ تاریخ ہیں۔(بحوالہ نگار تاریخ گوئی نمبر)۔(تذکرۂ درفشاں)

۳۴۔معین الادب یا معین الشعراء: ۱۳۵۲ ہجری مطابق ۱۹۳۳ عیسوی۔از غلام حسین آفاقؔ بنارسی۔مطبوعہ صدیق بک ڈپو لکھنؤ۔انڈیا۔یہ کتاب قطعاتِ تاریخی کا مجموعہ ہے کتاب کا نام تاریخی نہیں ہے،البتہ یہ مجموعہ ۱۳۵۲ ہجری میں اشاعت پذیر ہوا۔(بحوالہ نگار تاریخ گوئی نمبر)

۳۵۔ملکۂ تاریخ گوئی: ۱۳۵۲ ہجری مطابق ۱۹۳۳ عیسوی۔از مولانا شاہد حسین سوز ناروی کتاب کا نام تاریخی ہے۔"ملکۂ تاریخ گوئی" سے ۱۳۵۲ ہجری حاصل ہوتا ہے۔گمان ہے کہ یہ قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ ہوگا۔ہمارے ماخذ سے یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ کتاب فنِ تاریخ گوئی کے اصول وقواعد پر لکھی گئی ہے یا مجموعۂ قطعات۔سن اشاعت کا بھی کوئی اشارہ نہیں ہے۔

(بحوالہ سہ ماہی الاقرباء ۲۰۰۲ء مجریہ جنوری ا مارچ)

---

[۱] شاہد غم کے علاوہ تعزیتی قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ حضرت سیماب اکبر آبادی کی وفات پر ماہنامہ "پرچم" کراچی نے شائع کیا۔جسکا ذکر راقم الحروف نے اپنے سیماب اکبر آبادی کے مضمون میں تفصیل سے کیا ہے۔شاہد غم کی طرز کا ایک مجموعہ حضرت شاد جے پوری کی وفات پر "ذکر غم" ۱۹۲۰ء کے نام سے مکتبۂ اردو کراچی نے شائع کیا۔(صاحب مضمون)

۳۶۔ مجموعۂ تاریخ: ۱۳۵۲ ہجری مطابق ۱۹۳۳عیسوی۔ از سید محمد ہاشم جونپوری۔ اس کتاب کا تاریخی نام ''تاریخ آئینہ جمال'' ۲ (۱۳۵۲ھ) ہے۔ مجموعۂ تاریخ معروف بہ ''تاریخ آئینہ جمال'' کو ہاشم جونپوری کے صاحبزادے سید محمد مجتبیٰ حسن (جوالہ آباد میں ملازم تھے) نے طبع کروایا۔ جس میں ۴۰ھ ۵۰ ہجری کی تاریخیں بھی ہیں۔ ان تاریخوں کے علاوہ ۱۲۸۰ھ کی بھی ایک تاریخ ہے۔ جبکہ ہاشم جونپوری کی ولادت ۱۲۷۱ھ کو جونپور ہی میں ہوئی تھی اس حساب سے ۱۲۸۰ھ میں آپ کی عمر نو سال تھی۔ اس کے بعد ۱۲۸۱ھ سے ۱۳۳۷ھ کی تاریخیں اس مجموعے میں ہیں۔ ''مجموعۂ تاریخ'' کے صفحہ ۱۲۷ پر آپ کی وفات کی تاریخ بھی ملتی ہے۔ (ماخوذ تذکرۂ درفشاں)

۳۷۔ نگارستانِ اشعار: ۱۳۵۴ ہجری مطابق ۱۹۳۵عیسوی۔ از قاضی عبدالصمد صارمؔ سیوہاروی۔ ۱۳۵۴ ہجری میں آصف جاہ سابع (میر عثمان علی خاں) کی سلور جوبلی منائی گئی تو اس موقع پر کئی شعراء نے تاریخیں بھی لکھیں صارمؔ سیوہاروی نے اسے ترتیب دیکر دہلی سے شائع کیا۔ اور اس مجموعے کا تاریخی نام ''نگارستانِ اشعار'' ۱۳۵۴ ہجری رکھا یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ (بحوالہ تذکرۂ درفشاں)

۳۸۔ جامع التاریخ نمبر۱: ۱۳۵۶ ہجری مطابق ۱۹۳۵عیسوی۔ از مرزا بہادر علی حنفی۔ (بحوالہ نگار تاریخ گوئی نمبر) ''جامع التاریخ'' کے ابجدی عدد ۱۳۵۶ ہجری نکلتے ہیں۔ یہ شاید کتاب کا تاریخی نام ہو۔

۳۹۔ جامع التاریخ نمبر۲: ۱۳۵۶ ہجری مطابق ۱۹۳۵عیسوی۔ از سید دلدار حسین، اظہر الہ آبادی۔ یہ اظہر الہ آبادی کی تاریخوں کا مجموعہ ہے جو ''جامع التاریخ'' ۱۳۵۶ ہجری کے

---

۲ ''تاریخ آئینہ جمال'' میں ''آئینہ'' کے الف ممدودہ کے ۲ عدد اور صرف ایک یائے تحتانی کے ۱۰ عدد محسوب کر کے یعنی ۷۶ لیکر اعداد مطلوبہ پورے کئے ہیں۔ ورنہ اصول جمہور کے تحت صحیح طور پر ''آئینہ'' کے ۶۷ عدد محسوب کرنے چاہئیں تھے۔ (صاحب مضمون)

تاریخی نام سے ۱۳۵۶ ہجری ہی میں اسٹیم پریس حیدر آباد دکن سے طبع ہوا۔ (بحوالہ تذکرۂ درفشاں)

۴۰۔ اشکِ غم: ۱۳۶۱ ہجری مطابق ۱۹۴۲ عیسوی۔ علی احمد زاہد جبل پوری کی کہی ہوئی تاریخوں کا مطبوعہ مجموعہ ہے۔ جس میں مختلف شخصیات کی وفاتِ حسرت آیات پر قطعاتِ تاریخ وفات ہیں۔ اس مجموعے کا تاریخی نام "اشکِ غم" ہے جس سے ۱۳۶۱ ہجری نکلتے ہیں صرف صاحب تذکرۂ درفشاں نے اس کا ذکر کیا ہے۔

۴۱۔ احسن التاریخ نمبر ۱: ۱۳۶۱ ہجری مطابق ۱۹۴۲ عیسوی۔ از علی احمد زاہد جبلپوری۔ یہ زاہد جبلپوری کی تاریخوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کا دوسرا نام "حدیقۂ تواریخ" ہے جس سے ۱۳۴۴ھ ہجری نکلتا ہے۔ جو آغازِ کتاب کا سنہ ہے اور "احسن التاریخ" ۱۳۶۱ ہجری اختتامِ کتاب کا سنہ ہے۔ (بقول صاحب تذکرہ درفشاں یہ مجموعہ ۱۹۶۳ عیسوی میں طباعت کے لئے تیار تھا۔ ہوسکتا ہے اب تک طبع ہو چکا ہو۔)

۴۲۔ مشاہدۂ ریاض: ۱۳۶۶ ہجری مطابق ۱۹۴۶ عیسوی۔ از محمد ریاض الدین۔ مطبوعہ حمیدیہ پریس۔ حیدر آباد۔ دکن۔ انڈیا۔ سنہ اشاعت ۱۳۶۶ ہجری۔ 'مشاہدہ ریاض' سے ۱۳۶۶ عدد نکلتے ہیں۔ اور سالِ اشاعت بھی یہی ہے۔ (بحوالہ نگار تاریخ گوئی نمبر)

۴۳۔ احسن التاریخ نمبر ۲: ۱۳۶۷ ہجری مطابق ۱۹۴۶ عیسوی۔ یہ سید دلدار حسین، اظہر الہ آبادی کے قطعات تاریخ کا دوسرا مجموعہ ہے۔ احسن التاریخ سے ۱۳۶۱ نکلتا ہے جو کتاب کے آغاز کی تاریخ ہے۔ یہ مجموعہ ۱۳۶۷ء میں اعظم پریس حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔ کل چھپن (۵۶) صفحات کی کتاب ہے۔ (بحوالہ نگار تاریخ گوئی نمبر۔ تذکرہ درفشاں)

۴۴۔ بطلِ مغفور: ۱۳۶۷ ہجری مطابق ۱۹۴۷ عیسوی۔ کتاب کے مرتب کا نام۔ ناشرین کا نام نامعلوم "بطل مغفور" کے عدد ۱۳۶۷ ہوتے ہیں۔ شاید یہی سنِ اشاعت ہو۔ البتہ "فن

تاریخ گوئی" کے مولف کیپٹن منظور حسن نے آخری صفحات میں بطلِ مغفور کا صرف نام لکھا ہے۔ کاش کیپٹن صاحب کتاب کی دیگر معلومات بھی فراہم کر دیتے تو تحقیق کا حق ادا ہو جاتا یہ غالباً قطعاتِ تاریخ کی کتاب ہے۔

۴۵۔ اساس التواریخ: ۱۳۷۰ ہجری مطابق ۱۹۵۰ عیسوی۔ از قمر رُعینی۔ یہ قلمی نسخہ ہے۔ (بحوالہ الاقرباء مضمون قمر رُعینی) موصوف نے اپنے مضمون میں یہ ظاہر نہیں کیا کہ یہ قلمی نسخہ مجموعہ قطعاتِ تاریخ ہے یا اصول و قواعدِ تاریخ پر کوئی تحقیقی کتاب ہے۔ البتہ کتاب کا نام "اساس التواریخ" ۱۳۷۰ھ اعداد کا حامل ہے۔

۴۶۔ قطعاتِ تاریخ: ۱۳۷۱ ہجری مطابق ۱۹۵۱ عیسوی۔ از مولانا سعید الرحمٰن کانپوری۔ کتاب مطبوعہ ہے اور کراچی سے ۱۳۷۱ ہجری میں طبع ہوئی۔ نیز "قطعاتِ تاریخ" کا نام تاریخی نہیں ہے۔ (بحوالہ: نگار تاریخ گوئی نمبر)

۴۷۔ جمیع التواریخ: ۱۳۷۳ ہجری مطابق ۱۹۵۳ عیسوی۔ از قاضی محمد تحسین صدیقی، بیدلؔ بجنوری مطبوعہ پنجاب پریس لاہور۔ وطن بلڈنگ سے باہتمام شیخ محمد امین شائع ہوا۔ "جمیع التواریخ" کا نام تاریخی ہے۔ جس سے ۱۳۷۱ ہجری نکلتا ہے۔ اس میں بیدلؔ بجنوری کے نو سو ۹۰۰ قطعات تاریخ ہیں جو اُنہوں نے مختلف موقعوں پر کہے ہیں۔ (ماخوذ: تذکرہ درفشاں)

۴۸۔ عرضِ شادؔ: یہ قلمی نسخہ ہے جو راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔ از سید انور علی، شادؔ جے پوری (مرتب شاہد غم) یہ میرے جد امجد حضرت قبلہ شادؔ جے پوریؒ کا تاریخی کلام ہے۔ جس کو "عرضِ شادؔ" کے تاریخی نام سے ۱۳۷۵ ہجری میں محفوظ کیا گیا ہے۔ "عرضِ شادؔ" (۱۳۷۵ ہجری) میں شادؔ جے پوری کے کلام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کلام کا ہر مصرعہ حاملِ تاریخ ہے۔ اس مجموعہ میں ۱۳۶۰ ہجری (مطابق ۱۹۴۱ء) تک کا کلام ہے جس میں ہر سال ایک نعتیہ سلام بحضورِ سرورِ کائنات ﷺ، اور ہر سال ایک منقبت بحضورِ امامِ عالی مقامؓ کے علاوہ طرحی مشاعروں کی

غزلیں بھی تاریخی ہیں اور سہرے، رخصتی اور قطعاتِ تاریخ دفات وغیرہ بھی شامل ہیں الغرض شادؔ جے پوری کا جتنا کلام ہے سب کا سب تاریخی کلام ہے۔ جس کے ہر مصرعے سے سال گفتنی برآمد ہوتا ہے۔ اور ہر مصرعے اور ہر فقرے سے سال گفتنی نکالنے کی اکا دکا مثالیں تو بہت ملتی ہیں کہ کسی نے شوقیہ ایک آدھ قطعہ یا نعت ایسی کہہ لی ہو کہ اس کا ہر مصرعہ تاریخی ہو۔ لیکن شادؔ جے پوری کا ''عرضِ شادؔ'' ۱۳۷۵ھ میں سارے کا سارا کلام ہی اسی خصوصیت کا حامل ہے۔ ابھی حال ہی میں یعنی ۲۰۰۴ء میں خواجہ منظر حسن منظرؔ کی کتاب ''شیدِ تاریخ'' شائع ہوئی ہے۔ جس میں میرے محترم دوست خواجہ منظر حسن منظرؔ نے بھی شادؔ جے پوری کی طرح ہر مصرعے سے تاریخ نکالی ہے۔

۴۹۔ تاریخہائے دل پسند: یہ بھی قلمی نسخہ ہے جو راقم الحروف کے پاس ذاتی ذخیرہ کتب میں محفوظ ہے۔ اس میں میرے والد گرامی حضرت قبلہ سید خورشید علی مہر تقوی جے پوری (صاحب تذکرۂ دُرفشاں مترجم ترجمانِ بیخودی) کے مختلف موقعوں پر کہے ہوئے قطعاتِ تاریخ کا ایک ضخیم مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ۵۴۸ قطعاتِ تاریخ ہیں۔ اس کے تاریخی نام ''تاریخ ہائے دل پسند'' سے ۱۳۷۷ ہجری نکلتے ہیں۔

۵۰۔ نوائے سروش: ۱۳۷۹ ہجری مطابق ۱۹۵۹ عیسوی۔ از نظیر الحق، بسمل سنسہاروی۔ مرتبہ حکیم سید محمد یوسف پھلواروی مقیم گیا۔ مطبوعہ تاج پریس باری روڈ گیا (انڈیا) (بحوالہ تذکرۂ دُرفشاں)

۵۱۔ ذکرِ غم: ۱۳۸۰ ہجری مطابق ۱۹۶۰ عیسوی۔ اس مجموعے میں حضرت شادؔ جے پوری کی وفات پر مختلف شعراء کے کہے ہوئے قطعاتِ تاریخ ہیں۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں ''ہائے حضرتِ شادؔ جے پوری'' (۱۹۶۰ء) کے عنوان سے شادؔ جے پوری کے کلام (تاریخی کلام) کا نمونہ بھی ہے ایک دوسرے مضمون میں شادؔ جے پوری کے حالات زندگی بھی ملتے ہیں نیز صبا متھراوی کا تحریر کردہ فنِ تاریخ گوئی پر ایک جامع مقالہ ''ترویجِ فنِ تاریخ'' بھی ذکرِ غم ہی میں ہے۔ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوسکا ہے۔ ذکرِ غم سے ۱۹۶۰ء نکلتا ہے۔ ذکرِ غم کو مکتبۂ اردو کراچی نے ۱۹۶۰ء

میں شائع کیا۔

۵۲۔عندلیپ تواریخ: ۱۳۸۳ہجری مطابق ۱۹۶۳عیسوی۔ از خان بہادر سید مسعود حسن مسعوؔد۔ مطبوعہ الہ آباد انڈیا۔ ''عندلیپ تواریخ'' میں مسعود حسن مسعوؔد کے کہے ہوئے قطعاتِ تاریخ ہیں نیز اس کا نام تاریخی ہے جس سے ۱۳۸۳ہجری برآمد ہوتا ہے یہ کتاب قطعات تاریخ کا نادر نمونہ ہے۔ (ڈاکٹر فرمان)

۵۳۔عیون التواریخ: ۱۳۸۴ہجری مطابق ۱۹۶۴عیسوی۔ از سید غلام مصطفٰے نوشاہی۔ یہ قطعاتِ تاریخ کی کتاب ہے یا اصول وقواعد کے مباحث کی، اس کے بارے میں دیگر تفصیلات درج نہیں کی گئیں۔ (بحوالہ فنِ تاریخ گوئی ......ایک تحقیقی مطالعہ۔ مطبوعہ سہ ماہی الاقرباء)

۱۴۰۱ہجری تا ۱۵۰۰ہجری۔ پندرھویں صدی ہجری مطابق بیسویں واکیسویں صدی عیسوی۔

۵۴۔تاریخِ رفتگاں: جلد اول ۱۴۰۷ہجری مطابق ۱۹۸۶عیسوی۔ از احمد مرزا قادری المعروف صابؔر براری مرحوم اس مجموعے میں موصوف کے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۸۵ء تک مختلف شخصیات کی وفات پر کہے ہوئے قطعاتِ تاریخ ہیں جو ماہ جولائی ۱۹۹۸ء میں بہ اہتمام ادارۂ فکر کورنگی۔ کراچی سے شائع ہوئی۔ اس میں ۱۳۴ قطعاتِ تاریخ ہیں کتاب کا نام تاریخی نہیں ہے۔

۵۵۔وقایع تاریخی: ۱۴۰۸ہجری مطابق ۱۹۸۷عیسوی۔ از ڈاکٹر پروفیسر غلام مصطفٰے خاںؔ۔ یہ مجموعہ ڈاکٹر صاحب کی ۱۹۲۴عیسوی سے ۱۹۸۸عیسوی تک کہی ہوئی تاریخوں پر مشتمل ہے۔ الائیڈ پرنٹنگ کارپوریشن سے اس کتاب کی طباعت ہوئی ہے۔ کتاب کا نام ''وقایع تاریخی'' ہے جس سے ۱۴۰۸ہجری برآمد ہوتے ہیں۔ یہاں یہ امر تاریخ گوشعراء کے لئے خاص توجہ طلب ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ''وقایع'' کے ہمزہ کو ''ی'' کا قائم مقام مان کر دس عدد لئے ہیں۔ یہی اساتذۂ تاریخ گوئی کا اصولی اور جمہوری طریقہ رہا ہے۔

۵۶۔گلزارِ الہام: ۱۴۱۱ہجری مطابق ۱۹۹۰عیسوی۔ از سید محمد ممتاز۔ المعروف سید رفیق

عزیزی کے کہے ہوئے قطعاتِ تاریخ کا قلمی مسودہ ہے۔ جس میں ۱۹۹۰عیسوی سے فی الحال ۲۰۰۵عیسوی تک قطعاتِ تاریخ وفات کے علاوہ تاریخی سہرے وغیرہ ہیں۔ اسی لئے ''گلزارِ الہام'' کا ذیلی نام ''آہ اور واہ'' بھی رکھا ہے۔ جبکہ ''تاریخی نام'' ''تاریخ نفیس'' ۱۴۱۱ ہجری بھی رکھا ہے۔

۵۷۔ معدن التواریخ: ۱۴۱۲ ہجری مطابق ۱۹۹۲عیسوی۔ از پیرزادہ ابوطاہر فدا حسین فدآ۔ یہ فدآ کے قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ ہے جو لاہور سے شائع ہوا ہے۔ ''معدن التواریخ'' کتاب کا تاریخی نام ہے۔ جس سے ۱۴۱۲ ہجری نکلتا ہے۔ دیگر تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔

۵۸۔ دُرجِ تاریخ: ۱۴۱۸ ہجری مطابق ۱۹۹۷عیسوی۔ از نیساں اکبر آبادی۔ یہ کتاب قطعاتِ تاریخ کی کتاب ہے یا اصول و قواعد کی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ بلکہ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کتاب کہاں سے شائع ہوئی ہے۔ ''درج تاریخ'' سے ۱۴۱۸ ہجری بر آمد ہوتے ہیں۔ (بحوالہ ''فن تاریخ گوئی'' ......ایک تحقیقی مطالعہ مطبوعہ سہ ماہی الاقرباء)

۵۹۔ تاریخِ رفتگاں (جلد دوم): ۱۴۱۹ ہجری مطابق ۱۹۹۸عیسوی۔ از صآبر براری۔ یہ بھی جلد اول کی طرح مختلف شخصیات کی وفات پر صآبر براری کے کہے ہوئے قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ ہے۔ جس میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۸ء تک قطعاتِ تاریخ ہیں۔ مطبع نیو حجاز پریس۔ مرزا آدم خان مارکیٹ، کراچی۔ کتاب کا نام تاریخی نہیں ہے۔ سن اشاعت ۱۹۹۸ء ''تاریخ رفتگاں'' میں صآبر براری نے اپنے آغازِ تاریخ گوئی سے پہلے وفات پانے والی شخصیات کی تاریخیں بھی نکالی ہیں۔

۶۰۔ تاریخ رفتگاں (جلد سوم): ۱۴۲۱ ہجری مطابق ۲۰۰۲عیسوی۔ از صآبر براری۔ پہلی دو جلدوں کی طرح یہ جلد بھی مشہور شخصیات کی وفات پر صابر براری کے قطعات تاریخ کا مجموعہ ہے۔ (تاریخ رفتگاں)

۶۱۔ نفائسِ تاریخی: ۱۴۲۲ ہجری مطابق ۲۰۰۳عیسوی۔ از پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفٰے

خاںؔ۔ناشر: رائل بک ڈپو فوجداری روڈ۔ حیدرآباد۔سندھ۔کتاب میں پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی کہی ہوئی ۶۵ تاریخیں ہیں ۔کتاب کا نام نفائس تاریخی سے ۱۴۲۲ ہجری نکلتا ہے ۔''نفائس'' کے ہمزہ کو''ی'' کا قائم مقام مان کر دس عدد لئے ہیں۔

۶۲۔کتابوں پر تاریخی قطعات: ۱۴۲۴ ہجری مطابق ۲۰۰۳ عیسوی۔از صابر براری مرحوم ۔اس کتاب میں صابر براری کے ۱۹۶۰ء سے ۲۰۰۳ء تک چھپنے والی مختلف کتب پر کہے ہوئے ۱۸۵ قطعات تاریخ ہیں۔صفحات ۲۰۸ ہیں۔ناشر ادارۂ فکر نو۔کورنگی کراچی۔اس کتاب کا انتساب تاریخ گو شعراء اور تاریخ گوئی سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے نام ہے۔

۶۳۔نشیدِ تاریخ: ۱۴۲۵ ہجری مطابق ۲۰۰۴ عیسوی۔از خواجہ منظر حسن منظرؔ۔ناشر: میڈیا گرافکس۔نارتھ کراچی مطبع احمد برادرز پرنٹرز۔ناظم آباد۔کراچی۔سالِ اشاعت ۲۰۰۴ء یہ اپنی طرز کی پہلی منفرد کتاب ہے جو چھپ کر قارئین تک پہنچی ہے۔جس میں خواجہ منظر حسن منظرؔ نے اپنے سارے کلام میں ہر مصرعے سے تاریخ نکالی ہے۔جو بلاشبہ جنابِ منظر کی اہلیتِ تاریخ گوئی کا کمال ہے۔اس مجموعے میں نظم ''تاریخ کے آئینہ میں'' کے بیاسی مصرعے ہیں۔اور ہر مصرعہ تاریخی ہے۔ دوسری نظم کا عنوان ''قائداعظم'' ہے۔جس میں بائیس مصرعے تاریخی کہے گئے۔تیسری نظم کا عنوان ''اقبال'' ہے۔اس میں اٹھارہ تاریخی مصرعے ہیں۔اس کے علاوہ پچیس دیگر ادبی کتب پر قطعاتِ تاریخ ہیں جن کے ہر مصرعے سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔''نشیدِ تاریخ'' کا نام تاریخی نہیں۔

۶۴۔تاریخ ہائے مرحومین: قلمی نسخہ ہے۔از اصغر حسین، راغبؔ مرادآبادی۔موصوف راغبؔ مرادآبادی نے اپنی کتاب ''رگِ گفتار'' مطبوعہ ۱۹۸۹ عیسوی میں لکھا تھا کہ ''قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ تیار ہے۔نام تجویز نہیں کیا ہے۔لہٰذا مقالہ ہٰذا کی تیاری کے دوران حضرت راغبؔ مرادآبادی سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا۔تاکہ مجموعۂ ہٰذا کا نام اور دیگر معلومات حاصل کی جاسکیں، لیکن اپریل ۲۰۰۶ء میں حضرت نے فرمایا کہ ابھی تک نام تجویز نہیں کیا جاسکا۔ایک ہفتہ بعد دوبارہ

رابطہ کیا تو حضرتِ راغب مرادآبادی نے ''تاریخ ہائے مرحومین'' نام بتایا۔

۶۵۔ یادش بخیر: سنہ اشاعت نامعلوم۔ از شان الحق حقی یہ حقی صاحب مرحوم کے قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر جمیل الدین عالیؔ نے اپنے مضمون بعنوان 'حقی صاحب' مطبوعہ ماہنامہ ''قومی زبان'' انجمن ترقی اردو۔ پاکستان۔ کراچی ماہ جنوری ۲۰۰۶ء میں حقی صاحب کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے اس مجموعۂ قطعات ''یادش بخیر'' کی نشاندہی فرمائی ہے۔ (بحوالہ ماہنامہ قومی زبان۔ کراچی)

۶۶۔ نامِ کتاب مجہول: سنہ اشاعت اور کتاب کا نام دستیاب نہیں ہو سکا۔ مصنف و مؤلف پروفیسر محمد اسلم۔ پنجاب یونیورسٹی۔ پروفیسر صاحب نے لاہور اور کراچی کے قبرستانوں میں مدفون مشاہیر کی قبور پر کندہ کتبوں کے قطعاتِ تاریخ دو علاحدہ علاحدہ کتابوں میں مرتب کئے ہیں۔ (بحوالہ مکتوب ڈاکٹر محمد اسلم فرخی۔ ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ۔ وفاقی اردو یونیورسٹی۔ کراچی)

۶۷۔ وُرُودِ تاریخ: ۱۴۲۷ ہجری مطابق ۲۰۰۶ عیسوی۔ از مختار علی متخلص بہ مختارؔ اجمیری۔ (فرزند سید قربان علی) خوش گو شاعر ہیں۔ مجموعۂ منظومات ۲۰۰۱ء میں ''یہ شہر مرا شہر'' شائع ہو چکا ہے۔ مختار صاحب تاریخ گوئی میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ 'وُرُودِ تاریخ'' قطعاتِ تاریخ کا قلمی نسخہ ہے جس میں ۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۶ء تک مرحومین کی تاریخیں ہیں۔ قلمی نسخہ کا تاریخی نام موصوف کی فرمائش پر راقم الحروف نے نکالا ہے جس سے ۱۴۲۷ھ نکلتا ہے۔

ان مجموعوں کے علاوہ رئیس امروہوی کے تاریخی قطعات اُن کے ''قطعات'' کی دونوں جلدوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ''دوامُ العیش فی الائمۃ من قریش'' میں علامہ عبدالحکیم اختر شاہجہاں پوری کے ایک مضمون میں اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں، فاضل بریلوی کی بہت سی تاریخیں ہیں۔ ماہنامہ ''پرچم'' کراچی کے تعزیت نمبر میں حضرتِ سیمابؔ اکبرآبادی کی وفات پر مختلف شعراء کے ۱۱۲ قطعاتِ تاریخ چھپے ہوئے ہیں۔ اس کا ذکر راقم الحروف نے ''فکر و فن کی عظمت کے نقیب...... سیماب اکبرآبادی'' مطبوعہ الاقرباء مجریہ جنوری؍مارچ ۲۰۰۶ء میں کیا ہے۔ نیز حضرت صبا

متھراوی، پروفیسر حامد حسن قادری، منشی چند بہاری لال صبا جے پوری (انڈیا)۔ مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی جے پوری۔ (انڈیا) حفیظ ہوشیارپوری اطہر ہاپوڑی، عزیز الدین گجرانوالہ، شمیم صبائی متھراوی۔ (اسلام آباد)، قاضی امین الرحمٰن صدیقی لاہور۔ رزی جے پوری حیدرآباد محشر بدایونی۔ وغیرہ ایسے تاریخ گو شعراء ہیں جنہیں فنِ تاریخ گوئی میں بڑی مہارت رہی ہے اور ان حضرت گرامی کے قطعاتِ تاریخ کے مجموعے بھی شاید ہوں۔ مگر ہم انہیں تلاش نہیں کر سکے جسکا ہمیں افسوس ہے امید ہے آئندہ کوئی محقق ان تک بھی پہنچ سکے گا۔

(ب) فنِ تاریخ گوئی کے اصول وقواعد اور اعداد الاسماء پر کتب:

(۱۱۰۱ ہجری تا ۱۲۰۰ ہجری) بارہویں صدی ہجری مطابق سترہویں اٹھارہویں صدی عیسوی

۶۸۔ مفتاح التواریخ: ۱۱۹۱ ہجری مطابق ۱۷۷۷ عیسوی۔ تالیف شیخ محمد افضل مجتہر الہ آبادی (ولادت ۱۰۳۸ھ) ''مفتاح التواریخ'' سے ۱۷۷۷ء برآمد ہوتے ہیں۔ (بحوالہ سہ ماہی اردو۔ مقالہ ''دائرہ شاہ اجمل اور فارسی شاعری'' مقالہ نگار اکمل اجملی۔)

(۱۲۰۱ ہجری تا ۱۳۰۰ ہجری) تیرھویں ہجری مطابق اٹھارھویں صدی ہجری

۶۹۔ موجد التواریخ: ۱۲۷۱ ہجری مطابق ۱۸۵۴ عیسوی۔ مؤلفہ بہاء الدین شاہ۔ مطبع نظام المطبع۔ حیدرآباد دکن۔ سالِ اشاعت ۱۲۷۱ ہجری ہے۔ دیگر تفصیلات دستیاب نہیں۔ یہ کتاب کتب خانہ نظام صاحب حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے۔ (بحوالہ تذکرۂ دُرفشان)

۷۰۔ ایوانِ تاریخ: ۱۲۷۹ ہجری مطابق ۱۸۶۲ عیسوی۔ مرتبہ مولوی سید ناصر نذیر۔ فراق دہلوی۔ مطبوعہ ۱۲۸۲ ہجری حیدرآباد۔ دکن۔ کتاب کا نام تاریخی ہے۔ جس سے ۱۲۷۹ ہجری نکلتا ہے۔ یہ ہم اعداد الفاظ کا مجموعہ ہے جس میں ایک سے دو ہزار تک کے مساوی الفاظ شامل ہیں۔ لیکن یہ کتاب اب تقریباً نایاب ہے۔ (بحوالہ سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ)

۷۱۔ کانِ تاریخ: ۱۲۸۲ہجری مطابق ۱۸۶۵ عیسوی۔ ''کانِ تاریخ'' سے ۱۲۸۲ہجری برآمد ہوتے ہیں۔ راقم الحروف کو یاد پڑتا ہے کہ مذکورہ کتاب کرم خوردہ حالت میں اپنے والدگرامی کے پاس دیکھی تھی۔ مگر اب والد صاحب کے ذخیرۂ کتب میں موجود نہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب) راقم الحروف نے ''کانِ تاریخ'' کا ذکر قطعاتِ تاریخ کی کتابوں میں بھی کیا ہے۔ ویسے دراصل یہ کتاب مساوی اعداد الفاظ پر مشتمل ہے۔

۷۲۔ اُمُّ التواریخ: ۱۲۸۹ہجری مطابق ۱۸۷۲عیسوی۔ تالیف منشی حسین علی فرحتؔ دہلوی۔ (۴۲۴) چار سو چوبیس صفحات کی کتاب ہے۔ ابتدائی دو صفحوں میں تاریخ گوئی کے قواعد بیان کرنے کے بعد ایک سے لیکر (۲۰۰۰) دو ہزار اعداد کے مساوی الفاظ کا ذخیرہ ہے۔ جن سے مادہ تاریخ نکالنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ذاتی کتب خانے میں بھی موجود ہے اور راقم الحروف کے پاس بھی یہی ایڈیشن ہے۔ موجود فہرست کو دیکھتے ہوئے اس کتاب کو فنِ تاریخ گوئی کی پہلی کتاب قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۷۳۔ سرودِ غیبی: ۱۲۹۴ہجری مطابق ۱۸۷۷عیسوی۔ مُصنف سید محمد علی جویاؔ مرادآبادی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ انڈیا۔ سے چھپی ہے کل صفحات (۱۳۴) ایک سو چونتیس ہیں۔ ابتدائی صفحات میں فنِ تاریخ گوئی، اس کی قسموں اور مختلف صنعتوں کی تفصیلات دی ہیں۔ اس کے بعد مختلف قطعات تاریخ ہیں۔ جو حضرتِ جویاؔ مرادآبادی کی مہارت و مشّاقی تاریخ گوئی کا نادر نمونہ ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کا ذکر قطعاتِ تاریخ گوئی کی فہرست میں بھی ضروری سمجھا ہے۔ (بحوالہ مہر تقوی جے پوری۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

۷۴۔ مُلَخّصِ تسلیم: ۱۳۰۰ہجری مطابق ۱۸۸۲عیسوی۔ تالیف منشی انور حسین۔ تسلیمؔ سہسوانی۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۳۱۴ہجری مطابق ۱۸۹۶عیسوی میں مطلع العلوم پریس مرادآباد سے چھپی ہے۔ دوسری بار ۱۳۲۴ہجری میں طبع ہوئی۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اس کتاب کا اردو زبان میں

ترجمہ "مُلہم تاریخ" کے نام سے سید اقتدار احمد ساحر نے کیا ہے۔ مُلخصِ تسلیم (۱۲۰) ایک سو بیس صفحات کی کتاب ہے جس میں تاریخ گوئی کے مفہوم، ابجد کی اصطلاحات اور تاریخ گوئی کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے جو انتہائی مُدلّل اور مُستند ہے فنِ تاریخ گوئی کی اہم ترین کتاب ہے۔ اور ضامن علی جلال لکھنوی کی کتاب "افادۂ تاریخ" میں بیان کردہ اصولوں پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ جو ۱۳۱۴ ہجری کے ایڈیشن میں ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ نایاب ہے مگر انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں اس کا نسخہ محفوظ ہے۔ (بحوالہ تذکرہ درفشاں۔ نگار، تاریخ گوئی نمبر)۔

<u>(۱۳۰۱ ہجری تا ۱۴۰۰ ہجری)، چودھویں صدی ہجری مطابق بیسویں صدی عیسوی</u>

۷۵۔ افادۂ تاریخ: ۱۳۰۳ ہجری مطابق ۱۸۸۴ عیسوی۔ تالیف سید ضامن علی، جلالؔ لکھنوی۔ آغازِ تالیف کی تاریخ جلالؔ لکھنوی نے "مادّۂ التاریخ" سے ۱۲۹۲ ہجری نکالی ہے۔ اس مادۂ تاریخ میں تائے مُدور کے صرف پانچ عدد شمار کر کے ۱۲۹۲ حاصل کئے ہیں جو کسی طرح صحیح نہیں۔ حالانکہ جلالؔ لکھنوی نے پہلے اُستاد ناسخ لکھنوی (ولادت ۱۷۷۲ء۔ وفات ۱۸۳۸ء) نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے کہ ایسی "ۃ" کے جو "تے" کی آواز دے) چار سو (۴۰۰) عدد شمار کرنے چاہیں اور جو "تائے مدور" بغیر نقطوں کے لکھی جائے نیز "ہائے ہوز" کی آواز دے اُس کے پانچ عدد لئے جائیں۔ "مادۃ التاریخ" میں تائے مُدور اپنی اصلی آواز یعنی ت کی آواز دے رہی ہے۔ اس لئے استاد ناسخ لکھنوی کے مطابق اس کے پانچ عدد شمار کرنا درست نہیں۔ بلکہ یہاں چار سو شمار کرنے چاہیں تھے غلام علی آزاد بلگرامی نے "خزانۂ عامرہ" میں یہی اصول بیان کیا ہے۔ یعنی "مادّۂ التاریخ" کے دُرست عدد ۱۶۸۷ ہوں گے۔ امیر احمد، امیرؔ مینائی (ولادت ۱۸۲۷ء لکھنو۔ وفات ۱۹۰۰ء حیدر آباد دکن) سے مادّۂ تاریخ "مراۃ الغیب" میں اور معشوق حسین اطہر ہاپوڑی (ولادت ۱۸۷۳ء ہاپوڑ۔ وفات ۱۹۵۷ء کراچی) سے مادۂ تاریخ "لیلۃُ الاسریٰ" میں دونوں بزرگوں سے یہی تسامح اور مغالطہ سرزد ہوا ہے۔ جو بعد کے تاریخ گو شعراء کیلئے ہرگز قابل تقلید نہیں ہے۔ "افادۂ تاریخ" سے ۱۳۰۲ ھ نکلتے ہیں۔ یہ رسالے کے اختتام کی تاریخ ہے۔ اس رسالے

میں تاریخ گوئی کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے۔(جس میں بیشتر تسامُح کا شکار ہیں۔جلال لکھنوی کے اُن ہی تسامحات کا شکار ہو کر بعد کے شعراء میں غلط فہمیاں اور مغالطے جنم لے رہے ہیں۔)یہ رسالہ مدت سے نایاب تھا۔عرشی زادہ اکبر علی خاں نے اسے جولائی ۱۹۶۳ء کے ''نگار'' رامپور میں شائع کیا ہے۔(نگار۔تاریخ گوئی نمبر)

۷۶۔**نصیحتِ مختصر**: ۱۳۰۶ ہجری ۱۸۸۸ عیسوی۔تالیف شاہ محمد علیم الہ آبادی۔مطبع البلاغ لکھنو۔انڈیا یہ سولہ (۱۶) صفحات کا رسالہ ہے۔''نصیحت مختصر'' غالبًا تاریخی نام ہے۔اس سے ۱۸۸۸ عیسوی نکلتے ہیں۔(بحوالہ:''نگار،تاریخ گوئی نمبر''۔''تذکرۂ درفشاں''۔)

۷۷۔**گنجینۂ تواریخ**: ۱۳۱۳ ہجری مطابق ۱۸۹۵ عیسوی۔تالیف:میر نادر علی رعد۔مطبع فخر نظامی حیدر آباد۔دکن سے شائع ہوئی۔ابتدائی صفحات میں فنِ تاریخ گوئی کا اجمالی تذکرہ ہے۔ پھر ایک (۱) سے انیس سو (۱۹۰۰) تک کے اعداد کے مساوی الفاظ دیئے ہیں۔(بحوالہ نگار تاریخ گوئی نمبر)

۷۸۔**گلبن تواریخ**: ۱۳۱۳ ہجری مطابق ۱۸۹۵ عیسوی۔تالیف:میر مہدی حسن رضوی اکم۔مطبع فخر نظامی۔حیدر آباد۔دکن سے ۱۳۱۳ ہجری میں چھپی ہے۔سات سو (۷۰۰) صفحات کی کتاب ہے۔ابتدائی (۲۶) چھبیس صفحات میں حروفِ ابجد اور فنِ تاریخ گوئی کی بحث ہے۔ مؤلف کے مطابق ''ہمزہ'' چونکہ حروفِ ابجد میں شامل نہیں۔اس لئے اس کا کوئی عدد نہ لیا جائے گا۔ہاں!اگر ہمزہ اضافت کے ساتھ اس طرح آئے کہ اردو فارسی کتابت میں ہمزہ کو ''ی'' کی شکل دینا پڑے تو اس کے دس عدد محسوب ہوں گے۔(مؤلف گلبنِ تاریخ)۔فنِ تاریخ گوئی کے دیگر جید اساتذہ کرام کی اکثریت کا بھی یہی مشرب رہا ہے۔ہمزہ اور فنِ تاریخ گوئی کے دیگر مباحث کے بعد کتاب میں تین (۳) سے لیکر دو ہزار (۲۰۰۰) تک کیلئے الفاظ و مرکبات دیئے گئے ہیں۔اس اعتبار سے یہ کتاب اس نوع کی دیگر کُتب سے زیادہ جامع اور مفصل ہے۔کتاب کا

نام ''گلشنِ تاریخ'' تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۱۳ ہجری نکلتے ہیں۔ (بحوالہ ''تذکرہ درفشاں''۔
''نگار تاریخ گوئی نمبر'')

۷۹۔ عدد التاریخ: ۱۳۲۰ ہجری مطابق ۱۹۰۲ عیسوی۔ تالیف منشی انوار حسین، تسلیم سہسوانی۔
یہ اہم عدد الفاظ کا مجموعہ ہے جو ۱۳۲۰ ہجری میں اخبار رھبرِ اعظم۔ مُراد آباد۔ ہندوستان سے چھاپا گیا ہے۔ ''عدد التاریخ'' سے ۱۳۲۰ ہجری نکلتا ہے۔ ''عدد التاریخ'' کا ایک دوسرا تاریخی نام ''زنبیلِ تاریخی'' بھی ہے۔ (بحوالہ: ''تذکرہ درفشاں''۔ ''نگار تاریخ گوئی نمبر'')

۸۰۔ مَعدنُ الجَواہر: سنِ اشاعت نامعلوم۔ مؤلفہ: نجم الحسن افضل مدراسی۔ اس کتاب کا ذکر ولا حیدر آبادی عزیز جنگ۔ (صاحبِ غرایب الجمل) نے اپنی تالیف ''غرایب الجمل'' میں کیا ہے۔ افضل مدراسی ولا حیدر آبادی کے اُستاد تھے۔ (بحوالہ: تذکرہ درفشاں)

۸۱۔ غرایبُ الجمل: ۱۳۲۵ ہجری مطابق ۱۹۰۷ عیسوی۔ ۱۳۱۷ فصلی سنہ۔ تالیف عبدالعزیز عزیز جنگ متخلص بہ ولا حیدر آبادی۔ مطبوعہ عزیز المطابع حیدر آباد دکن۔ یہ کتاب (۴۰۸) چار سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے فنِ تاریخ گوئی پر نہایت مبسوط و جامع عالمانہ کتاب ہے۔ تاریخ گوئی کی اقسام، صنائع لفظی و معنوی کی وضاحت کے علاوہ سنہ ہجری، سنہ عیسوی، سنہ موسوی، سنہ مہدوی، سنہ فصلی، سنہ شمسی، سنہ بنگلہ پر روشنی ڈالی ہے اور اپنی کتاب ''غرایب الجمل'' کی تاریخ سنہ فصلی میں نکالی ہے۔ ۱۳۲۵ ہجری اور ۱۹۰۷ عیسوی کے مطابق سنہ فصلی ۱۳۱۷ فصلی تھا۔ ''غرایب الجمل'' سے ۱۳۱۷ (ف) برآمد ہوتا ہے۔ حساب جمل اور فنِ تاریخ گوئی سے متعلق اصطلاحی الفاظ کی فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ متقدمین، متاخرین اور معاصرین کے قطعاتِ تاریخ کے نمونے بھی دیئے ہیں۔
(بحوالہ ''تذکرہ درفشاں''۔ ''نگار کا تاریخ گوئی نمبر۔'')

یہاں یہ امر خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ولا حیدر آبادی نے ''غرایب الجمل'' میں لفظ ''غرائب'' کے ہمزہ کو ''ی'' کا قائم مقام مان کر دس ۱۰ عدد محسوب کیئے ہیں۔ یہی اساتذہ قدیم و

جدید کا متفقہ جمہوری اصول رہا ہے۔

۸۲۔ مُلہم تاریخ: ۱۳۲۶ ہجری مطابق ۱۹۰۸عیسوی۔ مترجم سید اقتدار احمد ساحر۔ یہ تسلیم سہسوانی کی فارسی زبان میں لکھی ہوئی کتاب "مُلخّصِ تسلیم" (۱۳۰۰ ہجری) کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بھی مطلع العلوم پریس۔ مرادآباد۔ (انڈیا) ہی سے ۱۹۱۲عیسوی میں چھپا ہے۔ "ملہم تاریخ" سے ۱۳۲۶ ہجری نکلتا ہے۔ (نوشتہ تاریخ۔ تذکرہ درفشاں اور نگار کا تاریخ گوئی نمبر سے ماخوذ)

۸۳۔ تاریخی خزانہ: ۱۳۲۶ ہجری مطابق ۱۹۰۸عیسوی۔ تالیف حافظ فیروز الدین ککے زئی۔ ۱۹۰۸ء میں اسلامیہ سٹیم پریس لاہور سے چھپی۔ چالیس صفحات کی کتاب ہے۔ اس میں فن تاریخ گوئی کی تاریخ، اس کے اصول وضوابط کے علاوہ تین ہزار بچوں اور بچیوں کے خوبصورت تاریخی نام ہیں۔ (بحوالہ نگار تاریخ گوئی نمبر)

۸۴۔ تاریخ الاسماء: ۱۳۴۴ ہجری مطابق ۱۹۲۵عیسوی۔ تالیف سید ابرار حسین ہاشمی۔ ۱۹۲۵ء میں فتح پور ہسوہ سے شائع ہوئی۔ کتاب کا نام تاریخی ہے۔ "تاریخ الاسماء" سے ۱۳۴۴ ہجری نکلتا ہے۔ یہ کتاب تاریخی نام نکالنے کے لئے مرتب کی گئی ہے۔ اس کا ایک حصہ "اعداد الاسماء" ہے اور دوسرا "لغات الاسماء"۔ "لغات الاسماء" میں "الف" سے "ی" تک کے حروف ردیف وار لغت کی طرز پر جمع کئے گئے ہیں۔ اور ہر لفظ کے مقابل اسکے ابجدی عدد اور اس کے معنی بھی درج کئے گئے ہیں۔ اس کے بعض اجزاء اکتوبر/نومبر ۱۹۸۱ء کے نگار میں شائع کئے جا چکے ہیں۔ مذکورہ کتاب دوسو صفحات پر مشتمل ہے۔ (بحوالہ نگار تاریخ گوئی نمبر)

۸۵۔ رہنمائے تاریخ اردو: ۱۳۵۷ ہجری مطابق ۱۹۳۸عیسوی۔ مؤلفہ حاجی محمد عبدالقادر مطبوعہ: مطبع معارف اعظم گڑھ سے ۱۹۳۸عیسوی میں چھپی ہے۔ کتاب کے مقدمے میں فنِ تاریخ گوئی کے اصول وقواعد پر بحث ہے۔ کتاب کے (۱۵۰) ایک سو پچاس صفحات ہیں۔ مغل بادشاہوں اور نوابوں سے متعلق مشہور شعراء کے قطعات تاریخ بھی ہیں۔ (بحوالہ نگار تاریخ گوئی نمبر)

۸۶۔مخزن التواریخ: ۱۳۵۸ہجری مطابق ۱۹۳۹عیسوی۔ تالیف سید انور علی شاد جے پوری۔ (راقم الحروف کے جدِ امجد) یہ ہم عدد الفاظ کا ضخیم قلمی نسخہ ہے۔ جس میں ایک سے (۵۰۰۰) پانچ ہزار اعداد کے مساوی الفاظ جمع کیے گئے ہیں۔ کئی سو اعداد کے مساوی ڈیڑھ اور دو دوسو الفاظ ہیں۔ بلا مبالغہ اتنی کثیر تعداد میں ذخیرۂ الفاظ اس قسم کی مطبوعہ کتاب میں اب تک تو میری نظر سے نہیں گزرے۔ یہ ضخیم و مفید قلمی نسخہ پہلے میرے والد ماجد قبلہ مہر تقوی جے پوری کے پاس تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد یہ نسخہ کچھ سال راقم الحروف کے پاس بھی رہا۔ اب یہ میرے چچا قبلہ سید مظہر علی مرحوم کے صاحبزادوں کے پاس ہے۔ سید مظہر علی مرحوم خود بھی ایک اچھے تاریخ گو تھے۔

۸۷۔فنِ تاریخ گوئی: ۱۳۵۹ہجری مطابق ۱۹۴۰عیسوی۔ تالیف مولوی نذر علی درد کاکوروی۔ یہ رسالہ قسط وار ماہنامہ "شاعر" آگرہ۔ انڈیا۔ میں (غالباً ۱۹۴۰ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ فنِ تاریخ گوئی پر نہایت تحقیقی کتاب ہے۔

۸۸۔اِلہاماتِ سلیمانی: ۱۳۵۹ہجری مطابق ۱۹۴۰عیسوی۔ مرتبہ محمد سلیمان حاذق پھلواروی۔ مطبوعہ سادات پریس شاہجہاں پور (انڈیا) ۱۹۴۰ء۔ اس کتاب کے مقدمے میں بزبانِ فارسی تاریخ گوئی کے اصول و قواعد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز بعض اقسام اور صنعتوں کی وضاحت بھی ہے۔ (بحوالہ تذکرۂ درفشاں)

۸۹۔انیسِ تاریخ گوئی: ۱۳۷۸ہجری مطابق ۱۹۵۸عیسوی۔ تالیف سید خورشید علی مہر تقوی جے پوری۔ فنِ تاریخ گوئی کی تاریخ ہے۔ اس میں ابجد کی ابتداء اور اس کی موجود ترتیب، ابجد کے اعداد کب قائم ہوئے۔ سب سے پہلا مادہ تاریخ کب اور کس نے، کس موقع پر کہا۔ اس فن کی تدریجی ترقی پر مبسوط تحقیق کی گئی ہے۔ کتاب کا نام تاریخی ہے جو اُس کی ابتدائے تالیف کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ قلمی نسخہ ہے۔ جو ڈاکٹر شاہد الوری (صاحبِ سخن در سخن) مرحوم کو اشاعت کیلئے راقم

الحروف نے دیا تھا۔ ڈاکٹر شاہد الوری کا انتقال ہوگیا۔ اب یہ کتاب فی الحال اُن ہی کے لواحقین کے پاس اُن کے ذخیرۂ کتب میں ہے۔ (بحوالہ ذکرِ غم۔ نگار تاریخ گوئی نمبر)

۹۰۔ ترویجِ فنِ تاریخ: ۱۳۸۰ ہجری مطابق ۱۹۶۰ عیسوی۔ تالیف رفیع احمد صبا متھراوی فاضلِ ادب۔ یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ جس میں فنِ تاریخ گوئی کے انتہائی اہم نکات پر عالمانہ بحث کی گئی ہے یہ مقالہ ''ذکرِ غم'' ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے۔ صبا متھراوی کے فرزند منظور احمد ناظم آباد کے مکتوب کے مطابق فی الحال اس کی علاحدہ اشاعت نہیں ہوسکی ہے۔ (بحوالہ ''ذکرِ غم'')

۹۱۔ معاون التواریخ: ۱۳۸۴ ہجری مطابق ۱۹۶۴ عیسوی۔ مولفہ محمد زبیر فاروقی شوکت الہ آبادی۔ مطبوعہ نوید پرنٹنگ پریس کراچی۔ طبع اول ۱۴۰۶ ہجری مطابق ۱۹۸۵ عیسوی۔ پھر ترمیم و اضافہ کے ساتھ طبع ثانی ۱۴۱۴ ہجری مطابق ۱۹۹۳ عیسوی۔ ''معاون التوارخ سے ۱۳۸۴ ہجری نکلتا ہے جو سالِ تکمیلِ کتاب ہے ہمارے زیرِ نظر طبع ثانی ہے۔ جس کے ابتدائی صفحات میں فنِ تاریخ گوئی کے اصول وقواعد بھی ہیں اور بعض صنعتوں کی وضاحتیں اور نمونے امثالاً دیئے ہیں۔ پھر ایک سے (۲۰۰۰) دو ہزار تک اعداد کے مساوی الفاظ ہیں۔ آخر میں کچھ بچوں اور بچیوں کے تاریخی نام دیئے ہیں۔ اسکے بعد طبع اول پر بعض مشاہیر کے تبصرے ہیں۔ کل صفحات (۴۷۵) چار سو پچھتر ہیں۔ یہ تاریخ کہنے والوں کیلئے مددگار ثابت ہوتی ہے۔ راقم الحروف کے پاس بھی ہے۔

۹۲۔ فنِ تاریخ گوئی ۲: ۱۳۸۷ ہجری مطابق ۱۹۶۷ عیسوی۔ تالیف کیپٹن منظور حسین ایم اے۔ مطبوعہ گلوب پبلیشرز۔ اردو بازار۔ لاہور۔ ۱۹۷۲ء مطابق ۱۳۹۲ھ میں شائع ہوئی۔ کتاب کا نام تاریخی ہے جس سے ۱۳۸۷ ہجری نکلتا ہے۔ کتاب (۲۱۶) دو سو سولہ صفحات پر محیط ہے۔ تحریر کافی گنجلک ہے۔ اس کتاب سے صرف خاص خاص اہل علم حضرات ہی استفادہ کرسکتے ہیں۔ فنِ تاریخ گوئی کا عام قاری اس کتاب سے کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ جدید اصولِ ترتیب اس میں نظر نہیں آتا۔ مضامین وابواب کی فہرست بھی نہیں ہے (بحوالہ نگار۔ تاریخ گوئی نمبر)

۹۳۔نوشتۂ تاریخ: ۱۳۹۲ ہجری مطابق ۱۹۷۲ عیسوی۔ اعجاز جودھپوری۔ ذبیر پرنٹنگ پریس۔ حیدر آباد۔ سندھ سے باراول ۱۹۷۸ عیسوی مطابق ۱۳۹۹ ہجری میں طبع ہوئی۔ چھیانوے (۹۶) صفحات ہیں۔ ابتدائی صفحات میں فنِ تاریخ گوئی کے اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد حروف ابجد کے مختلف قاعدوں مع اسمائے ابجدات کا ذکر کر کے تاریخ کہنے کا قاعدہ، مکمل مصرعے سے تاریخ نکالنے کا طریقہ نیز صوری ومعنوی تاریخ اور صنعتِ منقوطہ وغیر منقوطہ سے تاریخ نکالنے کے سہل طریقے سمجھائے ہیں۔ الغرض یہ کتاب فنِ تاریخ گوئی سیکھنے والے طالب علموں کے لئے معاون و مددگار ہو سکتی ہے۔ کتاب کا نام ''نوشتۂ تاریخ'' سے ۱۹۷۲ عیسوی نکلتے ہیں۔ کتاب ہذا کا ایک تاریخی نام ''قواعدِ تاریخ'' ۱۳۹۲ ہجری بھی ہے۔

(۱۴۰۱ ہجری تا ۱۵۰۰ ہجری)۔ پندرھویں صدی مطابق بیسویں و اکیسویں صدی عیسوی)

۹۴۔ ''نگار'' پاکستان فن تاریخ گوئی نمبر:

سالنامہ ۱۹۸۲ء۔ ۱۴۰۳ ہجری مطابق ۱۹۸۲ عیسوی۔ مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ زیر اہتمام فتح پور ایجوکیشنل سوسائٹی۔ کراچی۔ معاونت امراؤ طارق۔ ''ملاحظات'' کے عنوان سے ڈاکٹر فرمان نے ڈیڑھ صفحہ تحریر کیا ہے۔ پھر صفحہ نمبر ۵ سے صفحہ نمبر ۲۸ تک ڈاکٹر فتح پوری نے ''فنِ تاریخ گوئی کے اصول و مسائل'' پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد ''فنِ تاریخ گوئی سے متعلق ذخیرۂ کتب پر ایک نظر'' کے عنوان سے فنِ تاریخ گوئی کی اہم کتابوں پر جائزہ پیش کیا ہے۔ آخر میں سید ابرار حسین ہاشمی کے ''ہم عدد الفاظ'' اور ''لغات الاسماء مع اعداد'' دیئے ہیں۔ ۱۴۰۵ ہجری مطابق ۱۹۸۴ عیسوی میں ''نگار'' کے اسی ''فنِ تاریخ گوئی نمبر'' کو سنگِ میل پبلشرز۔ لاہور نے کتابی شکل میں شائع کیا ہے اور پھر ۱۴۲۵ ہجری مطابق ۲۰۰۴ عیسوی میں الوقار پبلی کیشنز لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔ لیکن بائیس سال کے طویل عرصے میں اس میں مزید تعلیقات نہیں کی گئیں۔

۹۵۔فنِ تاریخ گوئی ۳: ۱۴۱۰ ہجری مطابق ۱۹۸۹ عیسوی۔ مرتبہ غلام حسین کسرٰی منہاس۔

''نشید تاریخ'' کے خالق خواجہ منظر حسن منظر نے ''حرفے چند'' میں کتابِ ہذا کا حوالہ دیا ہے۔

۹۶۔ دُرِ تاریخ: ۱۴۱۵ ہجری مطابق ۱۹۹۴ عیسوی۔ مرتبہ انتظار احمد شمیم صبائی اتھراوی۔ ایک (۱) سے ۴۰۰۰ ہزار اعداد تک کے مساوی الفاظ کا ضخیم مجموعہ ہے مجموعے کا نام تاریخی ہے۔ اور فی الحال قلمی مسودہ کی شکل میں مُرتب کے پاس محفوظ ہے۔

۹۷۔ اردو میں تاریخ گوئی: سنہ معلوم نہیں ہوسکا۔ مرتبہ ڈاکٹر ابراھیم خلیل۔ یہ ڈاکٹر ابراہیم خلیل کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ جو چھپ نہیں سکا۔ بقول محترم بزرگ ڈاکٹر اسلم فرخی: ''میرے ایک شاگرد ڈاکٹر ابراہیم خلیل نے میری نگرانی میں ''اردو میں تاریخ گوئی'' پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا تھا۔ لیکن افسوس کوشش کے باوجود شائع نہیں ہوسکا''۔ (بحوالہ مکتوب ڈاکٹر اسلم فرخی۔ وفاقی اردو یونیورسٹی۔ کراچی مورخہ ۲۳/۱ مئی ۲۰۰۶ء بنام راقم الحروف) ''شاید یہ فنِ تاریخ گوئی پر پی ایچ ڈی کا پہلا مقالہ ہو''۔

۹۸۔ تاریخ گوئی اور اس کی روایت: ۱۴۲۵ ہجری مطابق ۲۰۰۴ عیسوی۔ مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ الوقار پبلی کیشنز۔ لاہور نے سید وقار معین کی نگرانی میں شائع کیا۔ یہ کتاب نگار کے تاریخ گوئی نمبر کا نیا ایڈیشن ہی ہے۔

۹۹۔ نامِ کتاب مجہول (بزبانِ انگریزی): سنہ اشاعت معلوم نہیں۔ بقول ڈاکٹر اسلم فرخی۔ مولانا حامد حسن قادری۔ مؤلف داستانِ تاریخ اردو کے صاحبزادے ڈاکٹر خالد حسن قادری نے تاریخ گوئی کے بارے میں ایک کتاب انگریزی میں مرتب کی ہے جو لندن میں شائع ہوئی ہے۔ محترم ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے مقالۂ ہذا کیلئے جو مفید و کار آمد معلومات رقم فرمائی ہیں وہ موصوف کی فن تاریخ گوئی سے غیر معمولی دلچسپی کا مظہر ہیں۔

(ج) تاریخ گو شعراء کے مختصر حالاتِ زندگی اور نمونہ کلام (صرف قطعاتِ تاریخ یا مادہ ہائے تاریخ) پر مشتمل ایک ہزار تاریخ گو شاعروں کا جامع و مبسوط تذکرہ۔ فنِ تاریخ

گوئی پر لکھی گئی کتب کی یہ تیسری اور منفرد قسم ہے۔ اس نوعیت کی ایک ہی کتاب ہے۔

۱۰۰۔ تذکرۂ دُرفشاں: ۱۳۸۰ ہجری مطابق ۱۹۶۰ عیسوی۔ مرتبہ سید خورشید علی مہر تقوی جے پوری۔ "تذکرۂ درفشاں" تاریخی نام ہے۔ جس سے ۱۹۶۰ عیسوی نکلتا ہے۔ جو آغازِ تالیف کا سنہ ہے۔ اختتامِ تالیف ۱۹۸۳ عیسوی میں ہوئی۔ "تذکرۂ زرفشاں" ۱۹۶۳ء عیسوی سے اختتام کی تاریخ نکالی۔ مگر بوجوہ تذکرۂ ہذا کا نام "تذکرۂ درفشاں ہی رہنے دیا۔ یہ مسودہ ۱۲۴۳ صفحات کا ضخیم مسودہ ہے جو باریک خط میں لکھا ہوا ہے اور جابجا الگ کاغذ چسپاں کر کے اضافے بھی کیئے گئے۔ یہ ضخیم قلمی مسودہ اس وقت انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کی تحویل میں ہے اور انجمن کے سہ ماہی "اردو" میں جلد نمبر ۷۴، شمارہ جنوری تا جون ۱۹۹۸ عیسوی سے مسلسل قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ ہر قسط میں (۸۰) اسی صفحات پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔ اس حساب سے آٹھ اقساط میں چھ سو چالیس صفحات شائع ہو چکے ہیں۔ اس تذکرے کی قسط وار اشاعت ابھی جاری ہے۔ بقول مشفق خواجہ مرحوم: "اردو اور فارسی میں شعراء کے تقریباً ہر نوعیت کے تذکرے لکھے گئے ہیں"۔ "لیکن ایسا کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا جس میں صرف تاریخ گو شاعروں کے تراجم ہوں۔ یہ کمی "تذکرۂ درفشاں سے پوری ہوتی ہے۔" (بحوالہ سہ ماہی "اردو" جلد نمبر ۷۴۔ جنوری تا جون ۱۹۹۸ء)

اس تذکرے میں ایک ہزار تاریخ گو شعراء کا ذکر ہے جس میں اب تک (۲۹۵) دو سو پچانوے شعراء کے حالات زندگی اور نمونہ ءکلام (یعنی قطعات تاریخ اور مادہ ہائے تاریخ) چھپ چکا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں انہی شائع شدہ اقساط سے بھر پور مدد لی گئی ہے۔ امکان یہ ہے کہ آئندہ شائع ہونے والی اقساط کے مطالعے سے فن تاریخ گوئی کی کتابوں میں ابھی مزید اضافے کی گنجائش ہے۔ اس تذکرے کے علاوہ بھی تاریخ گو شعراء اپنی کاوشیں جاری رکھے ہوئے ہیں مزید کتابیں بھی لکھی جائیں گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی بہت سی کتب راقم الحروف کی دسترس سے باہر ہوں۔ ایسی کتب سے قارئین کرام اور اہل علم حضرات راقم الحروف کو باخبر فرمائیں۔

ڈاکٹر نسیم اے ہائنز☆

جنوبی ایشیا میں ادب و تصوف اور علوم و فنون کا ارتقاء

تیرہویں صدی عیسوی کے ربع اول میں دہلی حکمت و دانش کا مرکز بن چکی تھی اور ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں سے اہل قلم' فنکار اور اہل دانش سرپرستی کی جستجو میں یہاں آنا شروع ہو گئے تھے۔ تاریخ کا یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کے حکمرانوں اور اُن کے شمال مغربی ہمسایوں کی ہوسِ ملک گیری اور سیاسی مہم جوئی کے سبب برصغیر کی شمال مغربی سرحدات آمدورفت کی کثرت کے باعث کمزور پڑ چکی تھیں۔ فارس اور مضافات کے ممالک پر منگولوں کے حملے کے بعد جو عدم استحکام پیدا ہوا اس کے نتیجہ میں وسطی ایشیا اور فارس سے علماء کے جنوب مشرق میں جزیرہ نمائے ہند کی طرف نقلِ مکانی کے عمل کو مزید مہمیز ملی۔ متعدد نامور اہل دانش اور امراء نے بھکر جو ناصر الدین قباچہ کا پایہء تخت تھا نیز ملتان اور اوچ جیسے مقامات پر پناہ حاصل کی۔ بعد ازاں ان تارکین وطن میں سے بیشتر التمش کے پایہء تخت دہلی میں وارد ہوئے۔ یہ تارکینِ وطن اپنے ہمراہ آرٹ' موسیقی' لسانیات و ادبی روایات کے ساتھ ساتھ عقائد کا ایک پورا نظام بھی لائے' انہوں نے ہندوستان میں شاعری کی نئی اصناف مثلاً غزل' قوالی' مثنوی اور رباعی متعارف کرائیں۔

دہلی سلطنت کے قیام کے لگ بھگ اُس وقت کے حالات کے پیشِ نظر مسلمان حکمرانوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ مفتوحہ علاقوں میں رواداری' تحمل اور بھائی چارے کے ماحول کو فروغ دیں تاکہ مقامی طور پر طاقتور حلقوں کے مابین دشمنی و مزاحمت کی فضا کو تبدیل کر کے امن بحال کیا جا سکے۔ ایس اے رضوی نے اپنی کتاب ''ہندوستان میں تصوف کی تاریخ'' (History of Sufism in India) کی پہلی جلد میں عہد وسطیٰ میں تصوف اور ہندو متصوفانہ روایت کے درمیان روابط پر ایک مکمل باب مختص کیا ہے۔ مصنف لکھتا ہے: ''گیارہویں صدی

☆ صدر (اردو ہندی پروگرام) شعبہء سنسکرت و مطالعاتِ ہند، ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ)

عیسوی کے بعد ہندوستان میں صوفیوں اور یوگیوں کے درمیان روابط اور تنازعات زیادہ بامعنی انداز میں روبہ اضافہ ہوتے رہے۔ رفاعیہ سلسلہ کے قلندر حضرات اور صوفیاء جو ترکی اور مصر تک محدود تھے گھومنے پھرنے والے یوگیوں سے واضح طور متاثر ہوئے۔ "بدقسمتی سے عصری ادب یوگیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے سے قاصر نظر آتا ہے جنہیں تاریخ میں تواتر سے "جوگی" کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ ایک حوالے کی رو سے شیخ ناصرالدین چراغ (اول) نے ایک "کامل یوگی" کو "سِدھاؤں" سے وابستہ قرار دیا ہے۔ بابا فرید کے "جماعت خانہ" کی محفلوں میں زیر بحث آنے والا یہ موضوع "سِدھازارین" کے لئے جن کے عقائد کی بنیاد 'ہٹھ یوگا' پر قائم تھی بڑی دلچسپی کا باعث تھا۔ رضوی نے ان مباحث پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو صوفیوں اور یوگیوں کے درمیان اپنے اپنے عقائد اور رسومات کے موضوعات پر ہوتے رہتے تھے۔ بعد کے برسوں میں تصوف پر مرتب کی جانے والی تحریروں میں معلومات کے ان نئے زاویوں کو بکثرت معرضِ اظہار میں لایا گیا جس نے ایک عظیم الشان ادبی نظام فکر کو فروغ دیا۔ اس طرح صوفیا اور ان کے مریدین نے پرامن بقائے باہمی اور یگانگت کے مقصد کے حصول میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ہم آہنگی کی بہترین مثال خود حضرت امیر خسرو کی ذات میں نظر آتی ہے۔

گزشتہ ایک ہزار سال کی ابتدائی صدیوں میں برصغیر میں امیر خسرو کے علاوہ بہت سے دیگر مصنفین بھی فارسی زبان میں اپنی تخلیقات مرتب کر رہے تھے۔ ہندوستان میں ابتداً فارسی زبان میں مرتب کی جانے والی تخلیقات کے بارے میں این میری شمل لکھتی ہیں "اگرچہ خسرو کو عہد وسطیٰ کا 'ہندی۔ فارسی' کا نمایاں ترین شاعر خیال کیا جاتا ہے اور بیک وقت ہندوستانی موسیقی کا موجد بھی تاہم خسرو ہی کو برصغیر کے فارسی میں لکھنے والے اولین عظیم شاعر کا اعزاز حاصل ہے بلکہ خسرو نے گزشتہ دو صدیوں سے جاری و ساری روایت کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا' تاریخی تصانیف مثلاً منہاج السراج (۱۲۶۰ وفات) کی "طبقاتِ ناصری" کے علاوہ عظیم صوفی شخصیت ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش" "(۱۰۷۱ وفات) نے لاہور میں اپنی تصنیف "کشف المحجوب" فارسی

زبان میں مرتب کی۔ابوالفرج رونی (۱۰۹۱ء وفات) اور مسعود سعد سلمان (۱۱۳۱ء وفات) کے ''شہر آشوب'' کی منظوماتِ زنداں ''حبسیات'' بھی فارسی ہی میں تحریر کی گئیں۔'' (شمل ۱۹۸۸ء)

ابوالحسن امیر خسرو ۱۲۵۳ء میں ضلع ایٹہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں 'پٹیالی' میں پیدا ہوئے انہوں نے اپنی زندگی میں سلطنت دہلی کے گیارہ بادشاہوں کا عہد حکمرانی دیکھا' انھوں نے اپنی معروف مثنویاں مثلاً 'نُہ سپہر' نیز گیت اور مکھڑیاں وغیرہ کثیر تعداد میں لکھے۔خسرو کے بارے میں ایشوری پرشاد اپنی کتاب ''عہد وسطٰی کا ہندوستان'' (Medieval India) میں لکھتا ہے:

''خسرو صرف شاعر ہی نہیں تھا وہ ایک ماہرِ حرب (Fighter) اور باعمل انسان تھا جس نے متعدد مہمات میں حصہ لیا اسے قدرت کی طرف سے موسیقی' رزمیہ گوئی' پرواز تخیل' قادرالکلامی' موضوعاتی تنوع' انسانی جذبوں اور محسوسات کے پُر تاثیر بیان پر جو قدرت اور کمال حاصل تھا نیز جنگ و محبت کی مناظر کشی کا جو ملکہ عطا ہوا تھا اس نے اسے ہر عہد کے عظیم ترین شعراء کی صف میں لا کھڑا کیا ہے'' (ص ۶۱۶)

یہ درست ہے کہ خسرو سے پہلے بھی ہندوستان کے اہل قلم فارسی میں لکھ رہے تھے لیکن خسرو کو جو حضرت نظام الدین اولیا ؒ کے مرید تھے یہ اولیت حاصل تھی کہ انہوں نے بیک وقت فارسی اور ہندوائی میں اپنا کلام تخلیق کیا۔'ہندوائی' سے میری مراد وہ زبان ہے جو اُس وقت دہلی اور اس کے مضافات میں بولی جاتی تھی' اُس وقت تک وہ زبان جسے آج ہم 'جدید معیاری ہندی یا اردو' کہتے ہیں تشکیل نہیں پا سکی تھی۔خسرو کو کثیر التخلیق اہل قلم (Prolific Writer) کہا جاتا ہے ان کے بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ شاہی دربار سے واپس آ رہے تھے تو اس عورت نے جوان کی گلی میں صفائی کرتی تھی درخواست کی کہ خسرو اس کے بیٹے کو فارسی اور ترکی زبان سکھا دیں تا کہ وہ حصول تعلیم کے بعد کوئی اچھی نوکری حاصل کر سکے کہا جاتا ہے کہ خسرو نے روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہونے والے عربی' فارسی اور ترکی الفاظ پر مشتمل چھوٹی چھوٹی نظمیں

لکھیں اور اُن کے 'ہندوائی' متبادلات بھی فراہم کیے۔ چنانچہ اس بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ عامتہ الناس کی کتنی بڑی خدمت تھی۔ بھولا ناتھ تواری کے مطابق اس طرح کے اشعار پر مشتمل سات جلدیں مرتب ہوئیں لیکن خسرو کی اس نوع کی شاعری سے بہت کم محفوظ رہ سکا ہے۔ جندل لکھتا ہے کہ ہندوائی میں خسرو کے اشعار جو آج بھی زندہ ہیں ہلکی پھلکی شاعری کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں اور لسانی اعتبار سے بھی شاہکار ہیں۔ (جندل ۱۹۵۵ص ۱۵)

امیر خسرو کے ہاں ذومعنی الفاظ کا استعمال نہایت خوبصورت انداز میں ملتا ہے۔ لسانی اتحاد و اتصال کا یہ عمل حکمرانوں کی کوششوں کے نتیجہ میں بھی جاری رہا۔ اکبر ابوالفضل حقائقی نے بلگرامی کی کتاب کا ترجمہ کیا جسے اے اے رضوی نے ہندی زبان میں منتقل کیا۔ امیر خسرو کو برصغیر سے بیحد پیار تھا چنانچہ انہوں نے مقامی منظر نگاری کا حق ادا کیا ہے جن میں گُل وثمر اور عقائد و روایات سب ہی شامل ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امیر خسرو لوگوں میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لئے ایسی شاعری پیش کرتے ہیں جو عوام الناس کو نئے الفاظ سے متعارف کراتی ہے اور بیک وقت ترک وطن کر کے آنے والوں کو اُن لفظوں سے آشنا کراتی ہے جو مقامی زبان اور تہذیب وثقافت کا حصہ ہیں۔ ان کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن کا ایک مصرعہ فارسی میں ہے اور دوسرا ہندوائی میں' اکثر اہل علم کا خیال ہے یہ اقدام دو مختلف ادبی روایات کو شیر وشکر کر دینے کا عمل ہے' جسے عظیم روایات کا سنگم بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ بہت سی ایسی شکلیں اگرچہ ناپید ہو چکی ہیں لیکن ہندی' فارسی مصرعوں پر ایک قوالی آج بھی برصغیر میں نہایت ذوق وشوق سے سنی جاتی ہے۔ ''زحالِ مسکیں۔۔۔۔ پیارے پی سے ہماری بتیاں''

قوالی صوفیاء کی سماع کی محفلوں کا نشانِ امتیاز رہی ہے' اپنی کتاب ''ہندو پاکستان میں صوفیانہ موسیقی'' (Sufi Music of India & Pakistan) میں ریگولا قریشی [۱] رقمطراز ہیں:

''اپنے شیخ یا روحانی پیشوا کی رہنمائی میں تربیت یافتہ موسیقاروں کے

[۱] مصنفہ ٹورنٹو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں جنہوں نے موسیقی پر کتاب لکھی ہے۔

طائفے ایسے اشعار گاتے ہیں جو متصوفانہ تجربہ کو مہمیز کرتے ہیں تاکہ سامعین مستفیض ہوسکیں سماع کے عمل سے صوفی اپنے موجود روحانی پیشوا، مرحوم بزرگان دین اور باری تعالی سے ربط و تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔" (قریشی ۱۹۸۶:۱)

میرے علم کے مطابق قوالی کے علاوہ کوئی ایسی صنف نہیں ہے جو اپنے حصار میں ورنیکلر شاعری کو کلیتہً یا تمام تر جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ قوالی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ لفظوں سے زیادہ معنوی اور تاثراتی فضا ہدف سماعت بنی رہتی ہے۔ چنانچہ فارسی مصرعوں اور شعروں پر قوال ہندی گرہیں لگا لگا کر ایک کیف پرور ماحول پیدا کر دیتے ہیں تاہم ضرورت ہے کہ قوالی کی صنف پر مزید تحقیقی اور تجزیاتی کام کیا جائے۔ امیر خسرو کی ہندی فارسی شاعری کے امتزاج پر مشتمل دوہوں اور پہیلیوں کے چند اشاراتی حوالے ملاحظہ ہوں:

(۱) زحالِ مسکیں مکن تغافل ۔۔۔۔
دورائے نیناں بنائے بتیاں ۔۔۔

(۲) شبانِ ہجراں دراز چوں زلف ۔۔۔
۔۔۔ پیا کی کھتیاں

(۳) گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چوں دیس
خسرو ایسی پریت کر جیسے ہندو جوئے
پوت پرائے کارنے جل جل کوئلہ ہوئے

(۴) ایک تھال موتی سے بھرا سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھالی پھرے موتی اس سے ایک نہ گرے

(۵) بالا تھا جب سب کو بھایا بڑا ہو کچھ کام نہ آیا

خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں، بوجھے نہیں تو چھوڑ دے گاؤں

(۶) بھیتر چلمن باہر چلمن بیچ کلیجہ دھڑکے

امیر خسرو یوں کہے وہ دو دو انگل سر کے وغیرہ وغیرہ

امیر خسرو کے ان شعری کارناموں کے علاوہ دیگر صوفی شعراء مثلاً شیخ حمید الدین ناگوری اور بابا فریدؒ نے بھی دوہے اور گیت لکھے۔ جنہیں سماع کی محفلوں میں پڑھا گیا جنہوں نے ہر طبقہ کے لوگوں کو متاثر کیا۔ لیکن آج ان شعری تخلیقات میں سے بہت کم دستیاب ہیں' فارسی اور ہندی لسانیات کے ربط وضبط کی یہ فضا جس کا آغاز نسبتاً مختصر شعری اشکال میں ہوا' ان کا ارتقا مولانا داؤد کی مرتبہ تصنیف ''چنداین'' مطبوعہ ۱۳۷۹ء میں ہوا۔

مولانا داؤد سے قبل کے صوفیاء کی تحریروں نے طویل شعری اشکال کے لئے فضا ہموار کر دی تھی جن میں فارسی مثنوی اور ہندی 'پریم انکھیاں'' کی روایات کے خدوخال نمایاں تھے' تاہم ان اشکال کو مثنوی قرار نہیں دیا جاسکتا جو قدیم علماء کا خاصہ تحریر تھا' مولانا داؤد کی ''چنداین'' کو عظیم ادبی روایات کے اتصال وارتباط کا مظہر کہا جاسکتا ہے' مثال کے طور پر یہ امتزاج ایک ایسی تمثیلی یا علامتی نظم کا مرقع تھا جس کی بنیاد نہ لیلے مجنوں جیسی کہانیوں پر تھی اور نہ شریں فرہاد جیسی داستانوں پر' بلکہ یہ اس ہندی رزمیہ نظم کا نتیجہ اثر تھا جو شمالی ہندوستان کے نام سے عوام میں بیحد مقبول تھی۔ اس میں فارسی مثنوی کی روایت سے مستعار لیے گئے تخیلی خاکوں کی جگہ علاقائی شہروں' ارضی مناظر' حیوانات ونباتات' عوامی رسم ورواج اور عوامی لباسوں کی عکاسی کی گئی ہے' اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مظفر عالم نے لکھا ہے: ''صوفیاء کے حلقوں میں صوفی حضرات کی لکھی ہوئی ان مثنویوں کو قبول عام حاصل ہونا ایک نہایت اہم واقعہ تھا جن کی بنیاد ہندی یا ہندوائی نفس مضمون (Theme) پر رکھی گئی تھی۔'' ''چنداین'' کی کہانی کا مزاج وآہنگ تمامتر 'ہندی' ہے یہ کہانی ایک شادی شدہ شہزادی چندا اور لورک نامی ایک شخص کی داستانِ محبت کے گرد گھومتی ہے جو آہیر ذات سے تعلق رکھتا تھا جس کے ساتھ شہزادی چندا ماں باپ اور لوگوں کے طعن وتشنیع سے بچنے کیلئے فرار ہو

گئی تھی'' (عالم ۲۰۰۴: ۹-۸۸) مظفر عالم نے مزید لکھا ہے کہ ''ابتدائی عہد کی ہندوائی مثنویوں میں مولانا داؤد کی ''چنداین'' کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ اس کے اشعار دہلی کی مسجد کے منبر سے پڑھے گئے بدایونی کے مطابق مولانا تقی الدین نامی ایک عالم دین نے اپنے خطبات میں ان اشعار کو شامل کیا ان کا خیال تھا کہ 'چنداین' الہامی صداقت پر مبنی ہے اور بعض قرآنی آیات کی تعبیر و تشریح سے ہم آہنگ ہے۔'' (ص ۸۹)

مثنوی کو فارسی رسم الخط میں تحریر کیا جاتا تھا لیکن اس کی زبان انتہائی مشرقی بولی یعنی ہندی تھی۔ صوفی شعراء شمالی ہند کی مقامی زبان میں لکھی گئی طویل بیانیہ منظومات سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ انہوں نے 'چوپائی' اور 'دوہا' کی بحور کی تفہیم پر خاص توجہ دی۔ مولانا داؤد نے اپنی ''چنداین'' کو قطعہ بند انداز میں مرتب کیا جنہیں 'مکھڈوک' کہا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ 'چنداین' میں ہر بند کو فارسی الفاظ میں متعارف کرایا گیا ہے تاہم ایک صدی بعد جو مثنویاں لکھی گئیں ان میں یہ اہتمام نظر نہیں آتا۔

میں جب ہارورڈ میں اردو ہندی کی تدریس پر مامور ہوئی تھی تو مجھے پہلی مثنوی اور بعد میں لکھی جانے والی مثنویوں میں ارتقائی تبدیلیوں کا جائزہ لینے کا موقع ملا' چنانچہ اس بات کی تصدیق ہوئی کہ چنداین کے طرز کے فارسی زبان میں تعارفی کلمات کا رواج بالکل ختم ہو گیا اور گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ عربی' فارسی اور ترکی الفاظ بتدریج استعمال ہونے لگے' چنانچہ آخری مثنوی تمام تر دیوناگری رسم الخط میں لکھی گئی۔

آج مولانا داؤد کی تصنیف ''چنداین'' تاریخی اہمیت کی حامل ہے اور اسے کثیر المحاسن فنی کاوش قرار دیا جاتا ہے اور اسی کے سر ''ہندی صوفی مثنوی'' کی روایت کے آغاز کا سہرا ہے جو بجا طور پر آئندہ پانچ سو سال میں لکھی جانے والی مثنویوں کے لئے نمونہ ثابت ہوئی۔ اکثر مثنویاں صوفی شعراء کی لکھی ہوئی ہیں چنانچہ عہد وسطٰی کا یہ ہندی ادب 'ہندی صوفی مثنوی' یا 'علامتی رومانوی روایت' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیے مظفر عالم ۲۰۰۴: ۸۹)

Sansritic & Persian Traditions of Learning in Medieval India: Interactions and Exchanges in South Asian Intellectual Culture Select Bibliography

Alam, Muzaffar. The languages of Political Islam in India c. 1200-1800. Permanent Block. Dehli 2004

Asani, Ali S. Ecstasy and Enlightenment: The Ismaili Devotional Literature of South Asia. I.B. Tauris Publishers. London, New York: 2002.

Baldick, Julian. Mystical Islam: an Introduction to Sufism. New York University Press. New York: 1969.

Blackburn Stuart H., Claus Peter J., Fluckiger Joyce B. and Wadley Susan S., eds. Oral Epics in India. Berkeley and Los Angeles: University of California Press. Berkeley, Los Angeles: 1989.

Dhar, Lakshmi, ed. Padumavati; a linguistic study of the 16th century Hindi (Awadhi) by Lakshmidhar. Luzac. London: 1949

Entwistle, Alan E., and Mallison Francoise, ed.s Studies in South Asian Devotional Literature. Manohar. Delhi: 1991.

Gupta, Mataprasad. ed. Candayan. Durga Printing Works. Agra: 1969.

Hines, Naseem, A. The Snakebite Episodes in Candayan: A Journey within a Journey. In Studies in Early Modern Indo-Aryan Languages, Literature and Culture. Ed. s Alan Entwistle, Carol Salomon, Heidi Pauwels and Michael C. Shapiro. Manohar. Delhi: 1999.

In Quest for the Correct Combination: The Home-coming Episode in Maulana Daud's Indo Sufi Masnavi *Candayan. In The Banyan Tree: Essays on Early Literature in new indo-Aryan Langrages. 2vol.s.Ed.Mariola Offredi. Manohar. Delhi: 2000.*

.........*Research Report on candayan. In Devotional Liter in South Asia Current*

Research 1997-2000.Ed.s Winand Callewaert and Dieter Taillieu Manohar. Delhi: 2000

Jain, Hiralal.ed. Nayakumracariu. Benares: Bhartiya Jnanapi tha Prakashan. Delhi: 1944

Jindal, K. B. A History of Hind i Literature. Manohar. New Delhi:1993.

Keith, A. B. A. History of Sanskrit Literature. Oxford: Clarendon Press. oxford: 1928.

Levy, Reuben. An introduction to Perian Literature. Columbia Univ. Press. New York: 1969.

Lawrence, Bruce B. Notes from a Distant flute: The Extant Literature of Pre-Mughal Indian Sufism. Tehran: Imperial Iranian Academy of Philosophy. Tehran: 1978

Nicholson, R.A. ed. Mathnavi of Jalaluddin Rumi. 4vols. Camridge: University Printing House. Camridge:1977(Reprint).

Qureshi, Regula. Sufi Music of India and Pakistan: Sound Context and Meaning. Cambridge University, Press. Cambridge, New York, Melbourne: 1988

Rizvi, S.A.A History of Sufism in India.2 vols.Manohar.Delhi:1975.

Saksena, B. Evolution of Awadhi (A Branch of Hindi).Delhi: Motilal Banarsidass. Delhi: 1971.

Schimmel, A.Deciphering the signs of God: A Phenomenological Approach to Islam. Albany: state University of New York Press. New York: 1994.

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران

پاکستان میں اقبال پر مطالعہ و تحقیق کے مسائل و عوامل

اقبال ہمارے اجتماعی وجود کے لئے نظریاتی اعتبار سے بے حد اہمیت رکھتا ہے علامہ نے برصغیر میں ہمارے الگ اور ممتاز تشخص کو مرتب و منظم کرنے کیلئے ہماری رہنمائی کی، اس نے برصغیر کے مسلمانوں کو متحدہ قومیت کے رومان انگریز تصور کے فریب سے نکال کر ہماری اجتماعی ہستی کی حفظ و بقا کے لئے قومیت کا ایک الگ، ممتاز اور مجرد تخیل پیش کیا۔ اقبال نے تحریک پاکستان کو نظریاتی بنیادیں فراہم کیں اور اس آزاد خود مختار اور علیحدہ ریاست میں ایک مثالی فلاحی معاشرے کا خواب دیکھا۔ برصغیر کے مسلمانوں پر تاریخ نے بھی ایک احسان کیا ہے، وہ یہ کہ ایک آزاد، خود مختار، علیحدہ اور ممتاز فلاحی ریاست کے قیام کے لئے نظریاتی بنیاد اور عملی جدوجہد کی قیادت کرنے والے رہنما نچلے درمیانے طبقے کے جدید تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اجتماعی شعور نے اس نظریاتی و عملی قیادت اور سیادت کو قبول کر کے گویا مستقبل کے ملک کے لئے ایک جہت کی نشاندہی کردی تھی۔ اقبال کا برصغیر کے مسلمانوں پر ایک احسان یہ بھی ہے کہ اس نے ہماری زندگی میں مذہب کی اہمیت، حیثیت اور حدود کو واضح کرتے ہوئے مذہب کے بارے میں دورِ زوال کے جمود سے جنم لینے والے تصور کو یکسر رد کر دیا اور مذہبی فکر کی تشکیل جدید کا آغاز کیا اور اس جسارت کی پوری قیمت بھی ادا کی (۱)۔

ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اقبال اور فکر اقبال کے موضوعات و مطالبات ہمارے لئے اہم ہیں تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ہمارے علاقائی، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی مذہبی اور ادبی منظر ماحول اور رخ نظر (مطمح نظر) میں کوئی بہت بڑا تغیر رونما نہیں ہوا۔ بدیہی طور پر ایسا سمجھا جاسکتا ہے کہ ہم نے پاکستان بننے کے بعد اقبال کو اپنے لئے ایک اہم حوالہ سمجھنے کے باوجود اس کی فکر کو نہایت منظم، مستعد اور مجرمانہ طور پر مستور رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں

کے اجتماعی تاریخی شعور کی نمائندگی کرتے ہوئے حکومت و طاقت کے نشے میں سرشار انگریزوں 'عددی اکثریت کے زعم میں مبتلا مغرور اور جارح ہندوؤں' اور مسلمانوں کی نادان نیم مذہبی نیم سیاسی جماعتوں کے خلاف نظریاتی محاذ پر جولڑائیاں لڑیں اور فتوحات حاصل کیں۔ہم پاکستانیوں نے توان کے احوال و نتائج سے کوئی بصیرت حاصل کی اور نہ ہی فتوحات کو صحیح طور پر اپنے مفاخر کا حصہ بنا سکے ہیں۔اپنے معروف خطبات (تشکیل جدید) کے دیباچے میں اقبال نے نہایت محتاط و منظم انداز میں فکر انسانی کے ارتقاء کی رفتار، سمت اور نوعیت پر نظر رکھنے اور تجزیہ کرتے رہنے کو فرض قرار دیا تھا۔ہم نے یہ فرض بھی ادا نہیں کیا۔اقبال نے سلطانی' ملائی اور پیری کو ہمارے ملی زوال کا سبب قرار دیا تھا۔تو پھر آخر کیوں آج بھی یہ تینوں ادارے ہماری اجتماعی زندگی پر قابض و متصرف ہیں اور انہی کے پروردہ چوبدار فکر اقبال کے گرد حصار بنا کر اسے محدود و مقید موضوع بنانے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔ان کا بنیادی ماخذ اقبال کے چند اردو فارسی اشعار ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنے موقف کی تائید میں سیاق و سباق سے ہٹا کر استعمال کرتے رہتے ہیں۔اقبال نے اس طبقے کو اندیشہ و نظر کا فساد قرار دیا تھا۔یہ لوگ فکر اقبال سے بعض نہایت بنیادی اختلافات رکھنے کے باوجود اقبال کو آزاد چھوڑنے پر آمادہ و تیار نہیں ہیں کیوں کہ سلطانی و ملائی و پیری کی تاریک مثلث اپنی قلمرو میں ''اقبال'' جیسے کسی خطرے کو برداشت نہیں کر سکتی۔

اقبال کی زندگی میں ہی انہیں ایک سنجیدہ علمی مطالعے اور توضیح کا موضوع بنا لیا گیا تھا۔اس میں موافق و مخالف دونوں قسم کی تحریریں شامل ہیں۔ان تحریروں کے لکھنے والوں میں اکثریت نے یا تو محض محبت اور عقیدت میں تعریف و توصیف سے کام لیا ہے یا نادانی و کم علمی اور تعصب کی بناء پر بے بنیاد نکتہ چینی کی ہے۔یہ دونوں قسم کی تحریریں اب تاریخ کا حصہ ہیں لیکن یہی سب کچھ نہیں۔اقبال کے فکر و فن کی مختلف جہات پر وقیع مضامین پر مشتمل معروف و معتبر ادبی رسائل کے خاص نمبر اس بات کی واضح نشاندہی کرتے ہیں کہ اقبال دانشورانہ غور و فکر کا سنجیدہ اور نہایت پر کشش موضوع تھے۔با ایں ہمہ ایسے چند رسائل میں نیرنگ خیال لاہور کا اقبال نمبر ۱۹۳۲ء (۲)

شیرازہ لاہور کا اقبال نمبر ۱۹۳۸ء (۳) رسالہ سب رس حیدر آباد دکن کا اقبال نمبر ۱۹۳۸ء (۴) علی گڑھ اردو میگزین کا اقبال نمبر ۱۹۳۸ء' رسالہ جو ہر جامعہ ملیہ کا اقبال نمبر ۱۹۳۸ شامل ہیں' یہ جملہ رسائل اپنے مشمولات کے تنوع اور وقعت کے اعتبار سے آج بھی اہم ہیں۔

اقبال پر قیام پاکستان سے قبل سامنے آنے والی مستقل تصانیف کی تعداد بھی کم نہیں اور ان کا آغاز بھی اقبال کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا۔لیکن اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے وقیع کتب میں تین نمایاں ترین ہیں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی روح اقبال ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی فکر اقبال اور عزیز احمد کی اقبال نئی تشکیل۔ان وقیع کتب پر انواع واقسام کے اعتراضات بھی ہوئے مثلاً روح اقبال میں آرٹ' تمدن اور مذہب پر گنجلک مباحث کے سوا اور کیا ہے۔مصنف ادبی تنقید کے اسرار ورموز اور سلیقے سے ناواقف ہے۔فکر اقبال کا محور اقبال کے فلسفیانہ افکار کی توضیح ہے۔ادب اور ادبی تنقید نام کو نہیں اور اقبال نئی تشکیل اقبال کے سیاسی معاشرتی اور ثقافتی تصورات پر پہلی مربوط ومنظم کوشش ضرور ہے لیکن مصنف ترقی پسند ہے اور ایک یہی خامی دوسرے کسی بھی نقص سے زیادہ بڑی ہے۔لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس سب کے باوجود آج بھی یہ تینوں کتب اپنی اہمیت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔اور بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کے پائے کی اقبال پر کوئی کتاب ابھی تک سامنے نہیں آئی چند ایک اچھی کوششیں موجود ہیں۔ان کتب سے ایک مشترک تاثر یہ سامنے آتا ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے اقبال مکمل طور پر ایک آزاد موضوع تھا اور اس موضوع پر معروضی انداز نظر سے کام کا آغاز ہوا تھا اور یہ کام کرنے والے جدید تعلیم یافتہ لوگ تھے۔یہ تحریک پاکستان کا زمانہ تھا اور نیم سیاسی نیم مذہبی جماعتیں اقبال کو اہمیت دینے پر آمادہ نہیں ہوئی تھیں۔یہ وہ دور تھا کہ جب اقبالیات ''جتھے دار'' اقبال شناسوں کی مشقِ ستم سے محفوظ ومامون موضوع تھا۔

آزادی سے پہلے ہم غلام تھے لیکن ہمارے خواب تمنائیں اور ہمارے آئیڈیل آزاد تھے پاکستان بننے کے بعد ہم معروف معنوں میں تو آزاد ہیں لیکن بوجوہ ہمارے خواب' تمنائیں اور آئیڈیل آزاد نہیں رہے۔ہم نہ تو اپنی انفرادی زندگی میں کوئی استحکام لا سکے ہیں اور نہ ہی اپنی اجتماعی

زندگی اور مذہب کے ربط و تعلق کو بھی سمجھ پائے ہیں۔ اقبال نے ظہور اسلام کو عقل استقرائی کا ظہور (۵) اور ختم نبوت کو انسانی فہم و شعور کی بلوغت کا اعلان قرار دیا تھا۔ (۶) ہم اقبال کی بصیرت کی تہذیبی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ و تیار نہیں ہو سکے ہم نے سوچ بچار کا کام غیر منصفانہ طور پر بانٹ رکھا ہے۔ ہماری تعلیمی ترجیحات، منصوبہ بندی اور نصابات کا تعین اور کسی حد تک تدوین کا کام غیر ملکی ماہرین کی جلی و خفی مشاورت اور مداخلت سے انجام پاتا ہے۔ ہماری تمدنی زندگی منہ زور الیکٹرانک میڈیا کے ہاتھ میں ہے۔ مذہب اور اس کے ہماری زندگی سے ربط و تعلق کے بارے میں غور و فکر اور رہنمائی کا کام روایتی علماء کی ذمہ داری ہے۔ حالانکہ ان نیک بخت لوگوں نے اپنی فہم و فراست کے مطابق' وہ جیسی بھی تھی برصغیر میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ اور خود مختار ملک کے قیام کی مخالفت کی تھی۔ اقبال ہو یا جناح دونوں تکفیر کے فتوؤں کی زد میں آئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی مسلمانی مجروح نہ ہوئی اور وہ اپنے یقین محکم کی روشنی میں آگے بڑھتے رہے۔ المناک بات یہ ہوئی کہ نیا ملک بن جانے کے بعد یہ نیک بخت طبقہ نوزائیدہ ملک کی نظریاتی زندگی کا مالک و مختار بن گیا بالکل اسی طرح جیسے تحریک پاکستان سے لاتعلق رہنے والے جاگیردار نوزائیدہ ملک کی سماجی و سیاسی زندگی کے اجارہ دار بن گئے۔ ان دونوں طبقوں کی فتوحات کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوریت کی حقیقی روح کی بنیاد پر وجود میں آنے والا ملک ایک حقیقی جمہوری معاشرے اور طرز حیات کا نمونہ پیش نہ کر سکا۔

نو آزاد پاکستان میں غیر متعلق طبقوں یعنی جاگیرداروں اور ملاؤں کی اجارہ داری خود بخود قائم ہو گئی یا اس کے محرکات کچھ اور تھے۔ آیئے اختصار کے ساتھ ایک تاریخی جائزہ لیتے ہیں۔ امریکی قیادت اور مدد کے ساتھ دوسری عالمگیر جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد یورپ اور امریکہ یعنی مغرب نے کمیونزم کے خلاف صف آرائی شروع کی۔ شرق اوسط کی سیاسی تقسیم نو کو بھی اس تناظر میں دیکھنا چاہیے کہ جہاں خلافت عثمانیہ کی مرکزیت کے خلاف عرب قوم پرستی کو ہوا دے کر متعدد عرب ریاستیں قائم کی گئیں۔ نسلی و لسانی عصبیت نے عربوں کو قوم پرست تو بنا دیا لیکن پھر اسلام ان کے لئے

ان کی تاریخ تہذیب اور ثقافت کا محض ایک عنصر بن کر رہ گیا۔اس کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ نے یہودیوں سے یورپ کو پاک کرنے کے نازی منصوبے کی دوسری شکل میں توسیع کرتے ہوئے صیہونی ریاست کے قیام کے نام پر دنیا بھر کے یہودیوں کو ایک مقام پر اکٹھا ہونے کا خواب دکھایا۔نئی عرب ریاستوں کے ساتھ اسرائیل کا قیام عمل میں آیا۔اعلان بالفور سے لے کر آج تک امریکہ اور برطانیہ نے بڑی ذہانت اور حکمت کے ساتھ یہودیوں اور عربوں کو آپس میں الجھایا ہوا ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد دنیا دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔امریکہ اور یورپ بہ مقابلہ اشتراکی روس۔یہ جانتے ہوئے کہ اسلام اشتراکیت کی نسبت سرمایہ دارانہ نظام سے زیادہ متصادم اور بیزار ہے اور یہ کہ نو آزاد مسلم مملکت پاکستان کے نظریاتی رہنما علامہ اقبال نے اشتراکیت کے ساتھ وسیع تر مکالمے کی ضرورت کی طرف واضح اشارے کیے ہیں۔نہ صرف یہ بلکہ اقبال یہ شعور بھی رکھتے تھے کہ کیپٹل ازم کے لئے اصل خطرہ بے خدا اشتراکیت نہیں' اسلام ہے(۷) مغرب نے اسلام کو بطور مذہب اشتراکی روس کے خلاف ایک حربے اور ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔اس فیصلے کے مطابق اشتراکی روس کو کفر و الحاد کا منبع قرار دے کر اسلامی ملکوں میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص مذہبی گروہوں اور نیم مذہبی نیم سیاسی جماعتوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔انہیں اخلاقی' مالی اور نظریاتی سرپرستی مہیا کی گئی۔مغرب نے آنے والے پچاس برسوں میں اسلام اور مسلمانوں کو جس نظریاتی جنگ کا ایندھن بنانے کا منصوبہ تشکیل دیا تھا' اقبال کے افکار و نظریات اس کے لئے ایک بڑا خطرہ بن سکتے تھے۔اقبال کے نظریاتی وجود کو ختم کرنا ممکن نہ تھا اس لیے اقبال اور فکر اقبال کو حفاظتی حصار میں لے لیا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد روایتی مذہبی حوالے کے ساتھ اقبال پر جو بھی لکھا گیا اسے اسی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔بایں ہمہ اگرچہ قیام پاکستان کی نظریاتی اور عملی جدوجہد میں مذہبی تنظیموں کا کوئی کردار نہیں رہا۔لیکن پاکستان کو امریکی سرد جنگ کا ایندھن بنانے کے لئے امریکہ اور یورپ کو یہاں ایک ایسا جاگیردارانہ معاشرہ درکار تھا کہ جس پر مذہبی طبقات کی گرفت مضبوط ہو۔

چنانچہ اس لائحہ عمل کو اختیار کیا گیا جو ابلیس نے اپنی مجلس شوریٰ میں اپنے مشیروں کے روبرو مسلمانوں کے لیے تجویز کیا تھا یعنی۔

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے ۔۔۔ یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اور احتیاط صد احتیاط کہ

توڑ ڈالیں جسکی تکبیریں طلسم شش جہات ۔۔۔ ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!

اور یہ کہ!

تم اسے بیگانہ کردو عالم کردار سے ۔۔۔ تا بساط زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات!

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام ۔۔۔ چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر ۔۔۔ جو چھپا دے اسکی آنکھوں سے تماشائے حیات!

اور حتمی بات یہ کہ۔

مت رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے ۔۔۔ پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

(ابلیس کی مجلس شوریٰ، الرمضان حجاز اردو)

قریباً نصف صدی تک پاکستان پر یہی موسم طاری رہا اور مختلف صورت میں اپنے ہمہ جہت اثرات بد کے ساتھ آج بھی جاری و ساری ہے۔ پاکستان کے لئے امریکی منصوبہ بندی کا یہ طویل دور ''افغان جہاد'' کا کامیابی کے ساتھ تمام ہو جاتا ہے۔ افغانستان میں روس کی شکست اور واپسی ایک بڑی وجہ بنی لیکن دیگر متعدد وجوہ کی بناء پر اشترا کی روس معروف اصطلاح میں ''ٹوٹ گیا'' تو اس کے ساتھ ہی امریکہ کے لئے اسلام اور مسلمان جو پہلے اشترا کی روس کے خلاف استعمال کے لئے آلہ کار کی حیثیت رکھتے تھے اب حریف کی صورت اختیار کر گئے۔ حریف کہنا شاید مناسب نہ ہو کہ اس میں دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔ موجودہ صورت حال میں امریکیوں نے یکطرفہ طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک طویل محاربے کا آغاز کر دیا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں دونوں کو ایک ساتھ گرفت کرنے کے لئے ''سرد جنگ'' کی اصطلاح ایجاد

کرنے والے ذہنوں نے "دہشت گرد" کی اصطلاح وضع کی ہے۔اسی تناظر میں آج پاکستانیوں کو اقبال کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

اس سارے پس منظر کا اثر غیر جامعاتی اور جامعاتی تحقیق اور اس کے رجحانات پر بھی پڑا۔یہ اسی افسوسناک صورت حال کا کرشمہ ہے کہ پاکستان میں نظریاتی تحقیق کیلئے بالعموم اور تحقیق اقبال کیلئے بالخصوص ایک سنجیدہ اور حوصلہ افزاء عالمانہ فضا قائم نہیں ہوسکی۔بڑی وجوہ دو ہیں۔پہلی یہ کہ ہمارے معاشرے اور ماحول پر متشدد نیم مذہبی نیم سیاسی گروہوں کی گرفت نہایت مضبوط رہی ہے۔ان گروہوں نے پندرھویں صدی عیسوی کے چرچ والے تمام اختیارات خود کو تفویض کر رکھے ہیں۔یہ کسی بھی قسم کی آزادانہ ذہنی سرگرمی یا معروضی تحقیق کو عقائد سے متصادم قرار دے کر اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔دوسری وجہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں کچھ ایسی ہی وجوہ کی بناء پر کہ جن کا ذکر ہوا آزادانہ ذہنی سرگرمی کا مرکز نہیں بن سکیں اور معقول معاوضے کے عوض محض ڈگریاں تقسیم کرنے والے ادارے بن کر رہ گئی ہیں۔یہ علم، ایجاد، بصیرت و حکمت اور دانائی کے مراکز نہیں بن پائیں۔ان میں بلا استثناء ایک فضا سی قائم کر دی گئی ہے کہ کوئی آزاد اور معروضی رویہ رکھنے والا محقق زیادہ دیر کام نہیں کر پاتا۔

پاکستانی جامعات میں تحقیق کی تاریخ کچھ زیادہ حوصلہ افزاء صورت پیش نہیں کرتی۔قیام پاکستان سے پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اقبال پر پی ایچ ڈی کی سطح کی تحقیق کا آغاز ہو چکا تھا۔قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۷ء میں کراچی یونیورسٹی کو اسلامی تصوف اور اقبال کے زیر عنوان پی ایچ ڈی سطح کی تحقیق کے آغاز کا اعزاز حاصل ہوا' مقالہ نگار ایک بنگالی اسکالر ابوسعید نورالدین تھے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور برصغیر میں قائم ہونے والی تیسری اور پاکستان کی سب سے قدیم یونیورسٹی کا اعزاز رکھتی ہے۔یہاں اقبال پر پی ایچ ڈی سطح کی تحقیق کا آغاز شعبہ فلسفہ سے ہوا **Iqbal's Philosphy of Knowledge** کے زیر عنوان ریسرچ اسکالر محمد معروف نے ۱۹۶۸ء میں کام مکمل کیا۔پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تحقیق اقبال کا آغاز ایم اے کی سطح پر چھٹی دھائی کے وسط میں ہو چکا تھا۔لیکن پی ایچ ڈی کی سطح پر اقبال کو قدرے تاخیر سے موضوع بنایا گیا۔ اور اس کی وجوہ تاحال نامعلوم ہیں۔نصف درجن سے زائد پبلک سیکٹر اور چند ایک پرائیویٹ سیکٹر کی یونیورسٹیوں

میں پی ایچ ڈی کی سطح پر اقبال پر کام ہو رہا ہے۔ یہاں جامعات میں ہونے والی تحقیق کے حوالے سے بعض عمومی اور اجتماعی نوعیت کے مسائل پر توجہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جامعاتی تحقیق میں اس وقت سب سے بڑا اور کڑا مسئلہ نگران تحقیق کی طرف سے عدم توجہ اور عدم تعاون کا ہے۔ ریسرچ اسکالرز اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق مقالہ لکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نگران تحقیق ان کی بھرپور رہنمائی کریں۔ ان کی بات سنیں' ان کو وقت دیں اور ان کے مسائل حل کریں۔ لیکن ایسا ہو نہیں پاتا۔ تجربہ یہ ہے کہ اگر کہیں کوئی اچھا مقالہ سامنے آجائے تو اس میں بھی نگران تحقیق کی مداخلت عمومی طور پر نظر نہیں آتی۔ اس ضمن میں جہاں ایک طرف نگران تحقیق کے فرائض ادا کرنے والے اساتذہ کے معاوضوں کو پرکشش بنانا نہایت ضروری ہے وہاں اس سے بھی زیادہ ضروری اور بنیادی بات نگران اساتذہ کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے کم ہی لوگ تیار ہو پاتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہماری جامعات میں عالم زیادہ ہیں اور علم کم۔ یہی عدم توازن بعض اوقات خبط عظمت کی وباء کو عام کر کے صلاحیت کو بے کار کر دیتا ہے۔ ہمیں اجتماعی طور پر کوشش کرنی چاہیے ایسا ہونے نہ پائے۔

ہماری جامعات میں اساتذہ کیلئے تربیتی ورکشاپس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ تحقیق اقبال کے حوالے سے اساتذہ کی تربیت کی ضرورت دو چند ہو جاتی ہے کیوں کہ عمومی طور پر تحقیق اقبال میں اسکالرز کی رہنمائی کرنے والے ماہرین ادب کے استاد ہوتے ہیں۔ وہ کسی حد تک زبان کے مسائل بھی سمجھ لیتے ہیں لیکن اقبال بین الاقوامی مطالعات کا عنوان ہے۔ اس میں سے لسانی مہارت کے علاوہ فلسفہ' مذہب' علوم اسلامیہ' معاشرتی علوم' معاشیات' سیاسیات' اور علم تاریخ سے اعلیٰ درجے کی واقفیت نہایت ضروری ہے لیکن کم از کم ان علوم کے تفصیلی مطالعات کی بجائے محض تحقیق اقبال سے متصل عنوانات کا احاطہ تو ضرور کیا جانا چاہیے تاکہ اس رجحان کی حوصلہ شکنی کی جاسکے جس میں اقبال پر لکھا جانے والا ہر تحقیقی مقالہ "تخلیقی ادب" کا شہکار بن جاتا ہے۔ تحقیق میں معروضیت کو ملحوظ خاطر رکھنا شرط اول ہے اور تحقیق اقبال میں اس کی ضرورت دوسرے علوم کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اقبالیات کے بیشتر ریسرچ اسکالرز زبان و ادب کے طالب علم ہوتے ہیں۔ بیشتر

صورتوں میں انہوں نے بطور مضمون اقبالیات سے متصل علوم کا مطالعہ تدریس کی کسی بھی سطح پر نہیں کیا ہوتا۔ایسے میں اساتذہ کے ساتھ ساتھ اقبالیات میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کروانے والی جامعات کو اپنے لازمی کورسز کو اس طرح سے منظم و مربوط کرنا چاہیے کہ اسکالرز کی اس کمی کا تدارک ہو سکے۔تحقیق میں مسلمات نہیں ہوتے اور نہ ہی اساتذہ کے عقائد اور تعصبات کو ریسرچ اسکالرز یا تحقیقی موضوع پر اثر انداز ہونا چاہیے۔

اقبالیات میں تحقیق بنیادی طور پر تاریخی تحقیق کی ذیل میں آتی ہے لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اقبالیات میں تحقیق کے لئے واضح، مرتب اور متفقہ اصول وضع کیا جائے۔کم از کم ہر یونیورسٹی یا ہر فیکلٹی اپنے طور پر اپنی حدود کے اندر ایسا کر سکتی ہے۔ایسا کرنے سے تحقیق نگاری میں رسمیات و متعلقات کے حوالے سے یک رنگی پیدا ہو سکے گی۔یہ بات واضح رہے کہ اقبالیات میں تحقیق کرتے ہوئے محض ادبی تحقیق کے اصول ہمارے اسکالرز کی کفالت نہیں پاتے۔شعری اور نثری متون کی حد تک تو شاید کام چل جائے لیکن بین العلومی مطالعات میں تحقیق کرتے ہوئے طالب علموں کے لئے تحقیق کی مختلف اور متنوع اقسام سے تعارف اور تربیت نہایت ضروری ہے۔ہمیں سندی تحقیق کو ایک عالمانہ سرگرمی بنانے کیلئے اپنے حصے کا کردار ادا کرنا ہوگا۔اس کیلئے اول شرط تو یہ ہے کہ یونیورسٹی کے متعلقہ شعبوں میں ماہر اساتذہ کی موجودگی کو یقینی بنایا جائے۔ایم فل یا پی ایچ ڈی کی سطح پر موضوعات تحقیق تجویز اور منظور کرتے وقت جہاں ایک طرف ریسرچ اسکالرز کی بنیادی تعلیم اور قابلیت کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے وہاں اس بات کا اہتمام کرنا بھی لازمی ہے کہ نگران استاد اس موضوع کے متعلقات پر عبور رکھتا ہو۔یہ ایک ایسا کام ہے جو خود یونیورسٹیاں ہی کر سکتی ہیں۔اگر یونیورسٹیوں میں اچھے اور محنتی طالبعلموں کی قلت ہو یا اچھے تحقیقی مقالے منظر عام پر نہ آرہے ہوں تو اس کا مطب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ یونیورسٹیوں میں اچھے اساتذہ اور اچھے تحقیقی رہنماؤں کا قحط ہے۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے آٹھویں دھائی کے اواخر میں ایم فل کی سطح پر تحقیق اقبال کا آغاز کیا۔علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پاکستان کی واحد یونیورسٹی ہے جہاں مطالعات و تحقیق اقبال کیلئے ایک الگ تدریسی و تحقیقی شعبہ قائم کیا گیا ہے۔اوپن یونیورسٹی کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں

ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر سندی تحقیق کو کھلے میرٹ کے ساتھ عام کرنے کا آغاز کیا گیا ہے۔ اوپن یونیورسٹی نے اعلیٰ سطح پر تحقیقی مقالہ نویسی کو پیشگی کورسز کی کامیاب تکمیل کے ساتھ مشروط کیا۔ ان کورسز کی حیثیت تربیتی نوعیت کی ہے۔ آج الحمدللہ پاکستان کی اقبال کو تحقیق کا موضوع بنانے والی تمام یونیورسٹیاں اپنے ایم فل اور پی ایچ پروگراموں میں کورس ورک کی تکمیل لازمی قرار دی چکی ہیں۔ اگرچہ یہ کورسز اس بات کی ضرورت کا شدید احساس دلاتے ہیں کہ ان کے مشمولات محتاط نظر ثانی کے محتاج ہیں اور بہت ساری جامعات کے کورسز مطلوبہ معیار پر بھی پورا نہیں اترتے اس کے باوجود یہ بات کیا کم ہے کہ اب ایم فل یا پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیق کرنے کے لئے اسکالرز کو صدر شعبہ کی نظر کرم کی بجائے اپنی ذاتی قابلیت پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہ فضا قائم کرنے میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ایم فل اقبالیات کے ضمن میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تحقیقی مقالے اپنے معیار اور مقدار کے اعتبار سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اس وقت تک شعبہ اقبالیات کے زیر اہتمام ۱۴۴ اسکالرز مختلف و متنوع موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھ کر ایم فل اقبالیات کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ ان موضوعات میں جہاں متون اقبال کو مختلف حوالوں سے تحقیق کا عنوان بنایا گیا ہے وہاں تقابلی مطالعات 'بین العلومی اور مابعد الطبیعاتی عنوانات پر تحقیق بھی شامل ہے۔ شعبہ اقبالیات ہی کے زیر اہتمام انیس موضوعات پر ایم فل اقبالیات کے مقالے اس وقت جانچ کے مرحلے میں ہیں۔ جبکہ ایک تحقیقی مقالہ جانچ کے مرحلے میں ہے۔ آٹھ موضوعات پر پی ایچ ڈی کے اسکالرز اپنا تحقیقی کام مکمل کر رہے ہیں۔

یہاں صرف اس بات کی طرف متوجہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شعبہ اقبالیات نے شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ اقبال پر معروضی تحقیق کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ بایں ہمہ تحقیق اقبال کے ضمن میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی خدمات اپنے تنوع 'اہمیت اور وسعت کے اعتبار سے آج ایک قابل تقلید مثال بنتی نظر آ رہی ہیں۔ اقبال کے فکر و فن کے مختلف جہات پر تحقیق اپنے معیار اور مقدار کے اعتبار سے اس قابل ہو چکی ہے کہ اسے کہیں بھی ایک اچھا نمونہ بنا کر پیش کیا جا سکتا

ہے۔علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اپنے روز افزوں تجربات کی روشنی میں عمل تحقیق اور موضوعات تحقیق
کے انتخاب میں وسعت اور بہتری لانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن اس سے بھی اہم تربات یہ ہے کہ
ہماری دیگر جامعات میں اقبال پر ہونے والے تھوڑے سے تحقیقی کام میں بہتری کے امکان پر توجہ دی
جائے۔یہاں میں اپنے پرانے شکوے کو بھی دہرانا چاہوں گا کہ ہمارے ہاں تحقیق اقبال آٹے میں
نمک کے برابر ہے لیکن ماہرین اقبال اس کثرت سے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا کیوں کر ہوا۔

پاکستان میں عامۃ الناس کہ سیاسی' ذہنی' مذہبی' معاشی اور ثقافتی طور پر تادیر مقید اور محبوس
رکھنا ممکن نظر نہیں آتا۔اسی سے یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ پاکستان میں عمومی طور پر تحقیق اور خصوصی
طور پر تحقیق اقبال کا مستقبل نہایت روشن ہے۔تاریخی مطالعات میں ازمنہ ثلاثہ یعنی ماضی حال
مستقبل کی تقسیم ہم اپنی سہولت کیلئے کر لیتے ہیں ورنہ معروضی طور پر تجزیہ کرتے ہوئے ہم انہیں تین
حصوں میں تقسیم نہیں کر سکتے۔یہ آپس میں جڑی ہوئی ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ادراک تسلسل
اور توجہ کے بغیر ممکن نہیں۔ ہمارا ماضی' حال اور مستقبل اپنے رخ اور رفتار سے اس بات کی طرف
اشارہ کر رہا ہے کہ بالآخر ہم اپنے آئیڈیل اور ذہنی مثالیے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔تحقیق
اقبال کے ضمن میں ہمیں موجودہ عالمی صورتحال اور مستقبل کے امکانات کو سامنے رکھ کے اقبال کے
سیاسی اور عمرانی تصورات پر تحقیق کرنی چاہیے۔ہمیں اقبال کے تہذیبی نصب العین کا محتاط جائزہ لینا
چاہیئے۔ہمیں اقبال کی تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اس کوشش کو آگے بڑھانا چاہیئے جس کا آغاز
انہوں نے ۱۹۲۳ء میں پیام مشرق سے کیا تھا۔موجودہ عالمی سیاسی تقسیم میں مستقبل بعید کا نقشہ قیاس
کرتے ہوئے مسلمانوں اور اشتراکیوں (چینیوں) کے مابین ممکنہ سیاسی اتحاد کی طرف اشارہ
امریکی دانشوروں کا محبوب موضوع ہے۔ہمیں اس موضوع پر افکار اقبال کی روشنی میں از سر نو غور
کر کے اپنا موقف وضع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ہمیں اسلام' عالم اسلام' ملوکیت' شخصی
آمریت اور خصوصاً عربی شہنشاہیت کے اسلام پر منفی اثرات کے حوالے سے اقبال کے موقف کو
سامنے لانا چاہیے۔ہمیں اقبال کے جملہ متون خصوصاً مضامین خطبات' مقالات اور مکاتیب کی

محتاط تدوین و تحشیے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس بڑے کام کیلئے ایم فل سطح کے ریسرچ اسکالرز کے گروپ بنا کر ان کو تحقیقی کام تفویض کیا جا سکتا ہے۔ یہ بڑا کام مختلف یونیورسٹیاں آپس میں مل کر بھی کر سکتی ہیں۔ اقبال کا مطالعہ اکیسویں صدی کے مسائل اور مناظر سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ علوم کی ترقی، معاصر معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں اور مستقبل کے سیاسی امکانات کی روشنی میں اقبال کے نظام فکر کا از سرِ نو مطالعہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جو اسکالر اس ضرورت پر توجہ دے گا وہ مستقبل کا بڑا اقبال شناس ہوگا۔

حواشی

۱۔ اس مسئلے پر اقبال کی تقلید کو تاریکی اور جمود کی فضا میں تربیت پانے والے علماء کے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اجتہاد کس قدر حساس موضوع ہے۔ اقبال کو اس کا شدید احساس ۱۹۲۴ء میں ہوا جب انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں اسلام اور اجتہاد کے عنوان سے ایک انگریزی خطبہ پڑھا۔ اگلے دن اُردو اخبارات میں اس انگریزی خطبے کے نمایاں نکات شائع ہوئے۔ اس پر ہنگامہ برپا ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لاہور کے مولوی ابو محمد دیدار علی نے اقبال کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کر دیا۔ اس ہنگامے کی خبریں پڑھ یا سن کر مدراس مسلم ایسوسی ایشن کے سیٹھ محمد جمال نے اقبال کو اجتہاد ہی کے موضوع پر جنوبی ہند میں لیکچرز دینے کی دعوت دی جسے اقبال نے بخوشی قبول کر لیا اور ۱۹۲۹ء کے اوائل میں تین خطبات مدراس، بنگلور، میسور اور حیدر آباد دکن میں پیش کیے۔ جبکہ تین خطبے ۱۹۲۹ء کے اواخر میں علی گڑھ میں پیش کیے گئے۔

۲۔ مرتبہ بدر الدین حسن و حکیم محمد یوسف، مطبوعہ کریمی پریس ۱۹۳۲ء یہ ۲۰۸ صفحات کا ضخیم نمبر تھا۔

۳۔ مرتبہ چراغ حسن حسرت

۴۔ از ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن

۵۔ خطبہ پنجم: اسلامی ثقافت کی روح، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم سید نذیر نیازی (لاہور: بزم اقبال، طبع دوم ۱۹۸۳ء) صفحہ ۱۹۳

۶۔ ایضاً ۱۹۴، ۱۹۳

۷۔ جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے (ارمغان حجاز اردو)

ڈاکٹر طاہر مسعود

کیا کہانی کا فن روبہ زوال ہے؟

جب سے میں نے کہانیاں لکھنی شروع کی ہیں میں اپنے گردوپیش کہانیوں اور ان کے کرداروں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ میں اپنی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھتا ہوں اور میرے کان مانوس اور نامانوس آوازوں کو اپنی سماعتوں کی گرفت میں لینے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ میں اہم اور کارآمد باتیں ہی سنوں۔ ایسی باتیں بالعموم اخبارات کے کام کی ہوتی ہیں۔ کہانیوں کے لئے تو ایسی باتیں زیادہ مفید ہوتی ہیں جو فضول، ازکاررفتہ اور لاطائل ہوتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے مرغی کو گھورے پر پنجہ مارتے مارتے دو چار دانہ دُنکا کھانے کے لئے مل ہی جاتا ہے مجھے بھی بے کار باتوں میں کام کی کئی باتیں مل جاتی ہیں۔ پھر یہ باتیں جب کسی کردار کے ذریعے میری کہانی میں در آتی ہیں تو وہ تخلیقی ہو جاتی ہیں۔ میں نے کہانیوں کو دل سے گھڑنا نہیں سیکھا۔ آج کل کے کہانی کار بڑے اونچے تخیل کے مالک ہیں، ایسی دورازکار کہانیاں اور قصے گھڑتے ہیں کہ میں انہیں پڑھ کر حیران رہ جاتا ہوں بلکہ سچ پوچھئے تو ان کے تخیل کی زرخیزی پر مجھے رشک آنے لگتا ہے۔

حاشا وکلا کسی کہانی کار کی توہین یا دل آزاری مقصود نہیں کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ کہانی کا ایک سرا کہانی کار کے باہر اور اس کا دوسرا خود اس کے اندر ہوتا ہے۔ رہے وہ کہانی کار جو باہر کی دنیا سے کوئی اثر قبول ہی نہیں کرتے مجھے اس جادوگر کی طرح لگتے ہیں جو اپنی خالی جیب سے کبوتر یا کھیلنے والی گیند نکال کر دکھا دیتا ہے۔ یہ شعبدہ بازی اردو کہانی کار کافی عرصے سے دکھا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں یہ بھی احساس نہیں رہا کہ تماش بینوں کی بھیڑ ان کے گرد سے چھٹ چکی ہے اور اب وہ خود ہی تماشا ہیں اور خود ہی تماشائی۔

میں چاہتا ہوں کہ کہانی میں سے یہ شعبدہ گری ختم ہو اور ہم قاری کو دھوکا دینا چھوڑ

دیں۔ ہمارے اردگرد ہزاروں اور لاکھوں نہیں تو سینکڑوں کہانیاں اور کردار موجود ہیں۔ پہلے میں ایسی کہانیوں کو تلاش کر کے انہیں اپنے کالم کا موضوع بنالیتا تھا۔ لیکن کالم نگاری کے اپنے تقاضے اور ضروریات ہیں۔ مجھے لگتا تھا کہ ان کہانیوں اور کرداروں کو میں کالموں میں ضائع کر دیتا ہوں۔ اس لیے کالم نگاری میں اب میں نے اس طرح کی کہانیوں اور کرداروں کو برباد کرنا ترک کر دیا ہے لیکن ایسی بہت سی کہانیاں آپ میرے کالموں کے مجموعے ''دل درد سے خالی ہے'' میں دیکھ سکتے ہیں۔ اگر میں ان کالموں کو کہانی کہہ کر کسی ادبی رسالے میں بھیج دیتا تو یہ کہانیوں کے طور پر شائع ہو جاتیں اور شاید ہی کسی قاری کو اس پر اعتراض ہوتا۔ رہا سوال نقادوں کا تو میں انہیں **Out Sider** سمجھتا ہوں اور کہانی کے معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں دیتا۔ یہ نقاد ہی ہیں جنہوں نے افسانے کو اس نوبت تک پہنچایا ہے کہ اردو افسانے کا قاری بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ کاش انور سجاد سریندر پرکاش (اپنی ایک آدھ کہانی کو چھوڑ کر) احمد ہمیش، رشید امجد اور اس قبیل کے دوسرے کہانی کار کہانی کو کہانی ہی رہنے دیتے اور اسے چیستاں نہ بناتے۔

مجھے سب سے زیادہ دُکھ ان میں سے ایک فن کار کے ضائع ہونے کا ہے۔ اس کہانی کار میں اپنے معاصروں میں کہانی لکھنے کا سب سے زیادہ ٹیلنٹ اور امکان تھا لیکن تخلیق کار کی فطرت میں جو نیکی چھپی ہوتی ہے، اس نیکی سے محرومی نے اسے برباد کر دیا۔ اس نے اپنا قلم اور روح شیطان کے پاس شہرت و دولت کے لیے رہن رکھوا دیا لیکن شیطان بھی وعدہ خلاف نکلا اور کہانی کار کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا، فن، دولت اور نہ شہرت۔ اس سے پتا چلا کہ فن کار کے لئے اپنی روح اور ضمیر کی حفاظت کتنی ضروری ہے۔ اسے بقول سلیم احمد ایک معنی میں درویش اور سادھو ہونا چاہئے۔ دل کو خواہشات سے خالی کیے بغیر کہانی میں تاثیر کا پیدا کرنا ناممکن ہے۔ اشفاق احمد کہا کرتے تھے کہ فن کار کے لیے شرط اولین سچائی ہے۔ اتنی سچائی کہ اگر وہ جھوٹا اور منافق ہے تو کم از کم اس کے اعتراف و اعلان سے نہ جھجکے۔ ہمارے زمانے کے تین بڑے کہانی کار قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور احمد ندیم قاسمی نے ساری زندگی ادب کو دیا۔ افسانوی ادب ہی ان کا اول و آخر حوالہ

ہے۔اس کے علاوہ وہ جو کچھ تھے ان کا ضمنی تعارف تھا۔ ہمارے آج کے کہانی کاروں کے لیے ان بڑے فن کاروں کی زندگیوں میں بڑا اسبق پوشیدہ ہے۔ یہ لوگ شہرت کے پیچھے بھاگتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ جتنی مشقت یہ شہرت اور تسلیم کیے جانے کے لئے کرتے ہیں۔ اسطرح کا عشر عشیر بھی کہانی اور کرداروں کی تلاش میں صرف کریں تو اس کے نتیجے میں شہرت تو ہاتھ باندھے کسی کنیز کی طرح ان کے سامنے کھڑی ہو گی۔ میں شہرت کی آرزو کو برا نہیں سمجھتا۔ تخلیق کار کے دل میں بھی چاہے جانے اور تسلیم کیے جانے کی تمنا ہوتی ہے لیکن ایسی کوئی خواہش ادب سے اس کی کمٹ منٹ کو کمزور کر دے تو یہ خواہش پھر بری ہے اور اس پہ قابو پانے کی ضرورت ہے۔

آخر کیا وجہ ہے کہ ہندی، فارسی اور عربی میں جس پائے کی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں، اردو اس دوڑ میں پیچھے رہ گئی جبکہ کہانی کے لئے جو خام مواد اردو والوں کے پاس ہے وہ شاید عربی اور فارسی کے کہانی کاروں کے پاس بھی نہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ بہترین تخلیقی اذہان کہانی کی طرف نہیں آ رہے اس لیے کہ کہانی کچھ Pay نہیں کرتی۔ زیادہ تر لکھنے والے اوسط درجے کا ذہن رکھنے والے ہیں جن کا مطالعہ مشاہدہ اور تجربہ سب ہی کمزور ہیں۔ دو تین کتابوں کی اشاعت کے بعد ان کہانی کاروں کو اس کی فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ کوئی ادبی رسالہ ان پر گوشہ شائع کر دے۔ یا ان کے فن اور شخصیت پر کوئی کتاب مُرتب ہو جائے۔ ان کے ساتھ جم خانہ میں کوئی شام منعقد ہو جائے۔ ادبی سماجیات نے ادیبوں کی روحوں کی توانائی کو گھن لگا دیا ہے۔ اگر کہانی کار کو واقعی کہانی کار بننا ہے تو ان فضول اور شرمناک سرگرمیوں سے خود کو الگ کرنا پڑے گا۔ عجیب بُات یہ ہے کہ اپنے اوپر وہ کتابیں بھی خود ہی مرتب کرتے ہیں اپنے اعزاز میں شاموں کا انعقاد بھی وہ اپنی ہی جیب خاص سے کرتے ہیں۔ آخر وہ کس کو دھوکا دیتے ہیں۔ شاید اپنے آپ کو اور کسی اور کو نہیں۔

جسے اپنی کہانی چھاپنی ہوتی ہے، وہ ایک ادبی رسالہ نکال لیتا ہے اور اپنی کہانیوں کی کتابوں کے لئے وہ توصیفی آراء کی طلب میں نقادوں کے در کے چکر لگا لگا کر اپنے جوتوں کے تلے

گھس ڈالتا ہے۔ آخر ہمارے کہانی کاروں کی خودداری کہاں رخصت ہوگئی ہے۔ فن کار کی انا تو ایک زمانے میں فن کار کے سچے ہونے کی پہچان تھی۔ اس فن کارانہ انا کی موت نے ہمیں یہ دن دکھائے ہیں کہ ادیب کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ وہ اپنے زمانے سے کٹا ہوا ایک اجنبی بن کر رہ گیا ہے جس کی کوئی عزت و وقعت پڑھنے والوں کے دل میں نہیں رہ گئی ہے۔ اب اگر معاشرہ کھلاڑیوں اداکاروں اور ٹی وی ڈرامے لکھنے والوں کو سر پر بٹھاتا ہے تو تخلیقی فنکاروں کا شکوہ، شکوۂ بے جا ہے۔

ادھر پانچ دس سال میں کتنی ایسی کہانیاں لکھی گئی ہیں جنہیں شاہکار کہا جا سکے۔ نیر مسعود اور اسد محمد خاں کی بات میں نہیں کرتا کیونکہ یہ پرانی نسل کے کہانی کار ہیں۔ میرا اشارہ ان کے بعد آنے والی نسل کی طرف ہے۔ آصف فرخی نے اپنے رسالے میں ایک افسانہ نگار کی کہانی شائع کی کہانی طویل تھی اور انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ ہندوستان میں ہندی زبان میں بھی کہانیاں لکھتے ہیں اور بہت مقبول ہیں۔ میں نے بڑے اشتیاق سے کہانی پڑھنی شروع کی۔ کہانی کی زبان اچھی تھی۔ لیکن کہانی آرائشی اسلوب تلے دب کر کراہ رہی تھی۔ چند صفحے سے زیادہ مجھ سے پڑھا نہ جا سکا۔

میں کہانیوں میں اسلوب بیان پہ غیر ضروری محنت کو فنکارانہ عمل نہیں سمجھتا۔ بیدی اپنے اسلوب پر منٹو سے زیادہ محنت کرتے تھے۔ ان کی کہانیاں پڑھیے تو لگتا ہے کہ ایک ایک لفظ سوچ سوچ کر ٹانکا گیا ہے۔ اس کے برعکس منٹو کے ہاں ایک روانی اور بہاؤ کی کیفیت ملتی ہے۔ کہانی اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے مشتاق احمد یوسفی سے زیادہ ابن انشاء کا مزاح لطف دیتا ہے۔ ہر لفظ جو سوچ سوچ کر اور گھڑ گھڑ کو لکھا جائے۔ تحریر میں ''آورد'' کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اسلوب کو تو کسی پہاڑی چشمے کی طرح ہونا چاہیے جو اچھلتی، زور کرتی اور شور مچاتی آگے بڑھتی لہروں کا دوسرا نام ہے۔ اسلوب میں اندرونی قوت ہونا چاہیے جو ہر سچویشن جذبے اور خیال کو بے ساختگی سے بیان کر دے۔ اسی لیے منٹو نے بیدی سے کہا تھا کہ بیدی تم سوچتے بہت زیادہ ہو، تم لکھنے سے پہلے سوچتے ہو لکھنے کے دوران سوچتے ہو اور

لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو!! منٹو جو ہمارا سب سے بڑا کہانی کار ہے، کہتا تھا کہ کہانی کی پہلی سطر میں لکھتا ہوں اور باقی کہانی وہ سطر مجھ سے لکھوا دیتی ہے۔ بھلا اس بات کے کیا معنی ہیں۔ ایک سطر پوری کہانی کیسے لکھوا سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ پہلی سطر منٹو کے باطن میں پوشیدہ تخلیق کے چشمے میں کسی زوردار پتھر کی طرح گر کر ہلچل مچا دیتی تھی۔ پھر سطح پہ جو مدوجزر بنتے تھے، جو لہریں اٹھتی تھیں اور کناروں سے جا کر ٹکراتی تھیں، اسی سے وہ کہانی جنم لیتی تھی جس کو لکھنے سے پہلے خود منٹو کو بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا لکھنے جا رہا ہے۔ چنانچہ جب کسی کہانی کے اختتام پر کوئی اعتراض کرتا تھا اور اسے تبدیل کرنے کا مشورہ منٹو کو دیتا تھا تو منٹو کا جواب ہوتا تھا کہ کہانی نے مجھے اسی اختتام تک پہنچایا ہے، میں اسے بدلنے کا حق نہیں رکھتا۔ یہ ہے تخلیقی فن کار کا رویہ:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

اس میں کیا شبہ ہے کہ سب سے بڑا کہانی کار خداوند تعالیٰ ہے جس نے اپنی الہامی کتابوں میں کتنی ہی کہانیاں بیان کی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہ سچی کہانیاں ہیں اور ان میں ہمارے لیے سیکھنے اور سمجھنے کے بہت سے سبق پوشیدہ ہیں۔ انسانوں کی لکھی ہوئی کہانیاں بھی بے مقصد نہیں ہوتیں۔ ان سے بھی انسانوں کی فلاح وابستہ ہے۔ انسان کو بہتر انسان بننے میں مدد دینا، انسانی معاشرے کے چہرے اور اس کے خدوخال کو خوشنما بنانے کی فکر کرنا اور اس مسرت سے ہمکنار ہونا جو ایک اچھی کہانی ہمیں فراہم کرتی ہے لیکن اب ہم نے کہانی سے یہ کام لینا چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے آج کی کم از کم اردو کہانی چھپ کر بھی ناخواندہ ہی رہتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

اپنی ذات میں ایک دبستانِ شعر۔۔۔قابل گلاؤٹھوی

یہ میری محرومی ہے کہ مجھے اس کج کلاہ، غیور اور خوددار شاعر سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا' جن کا نام قابل گلاؤٹھوی تھا اور جنہیں وفات پائے اب قریباً ربع صدی گزر چکی ہے۔ لیکن میری خوش قسمتی ہے کہ جب میں میانوالی کے صحراؤں' سیالکوٹ کے گرد و پیش اور لاہور کے نواح میں نوزائیدہ ملک کی زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے نہروں کی تعمیر پر مامور تھا تو اقلیم سخن کے شہر یار قابل گلاؤٹھوی کی شاعری نے جو اس دور کے ممتاز ادبی پرچوں میں چھپتی تھی' میری ذہنی آبیاری کی اور میرے ادبی ذوق کی پرورش میں گراں قدر حصّہ لیا۔ اب مجھے یاد نہیں آرہا کہ میں نے ان کے مندرجہ ذیل اشعار کہاں پڑھے تھے:

کیوں ہو بندوں سے مجھ کو خواہش جاہ | نام قابلؔ ہے جب رحیم اللہ

حُبِ دنیا نہیں مری فطرت | میں ہوں لختِ دل حبیب اللہ

ہوں جگر بند اُمتہ الکبریٰ | میرے خادم ہیں تاج وتخت وکلاہ

اس نظم میں شاعر نے نہ صرف اپنا تعارف اور شجرۂ نسب پیش کر دیا تھا بلکہ پورے عجز و انکسار سے اپنی شخصیت کے وہ اوصاف بھی بیان کر دیئے تھے جو انہیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملے تھے۔ گلاؤٹھی بھارت کے دریائے گنگا و جمنا کے دوآب میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو ضلع بلند شہر میں دہلی سے اڑتالیس میل کے فاصلے پر واقع تھا لیکن یہاں ایسے صاحبان علم و حکمت پیدا ہوئے کہ مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ان کی درویشی اور بے نیازی کا ذکر رقعات عالمگیری میں کیا اور لکھا:

"اگر سادات عظام گلاؤٹھی طالبان منصب و جاہ بودے مدام قلمدان وزارت عظمٰی بدست ایشاں بودے"

سادات گلاؤٹھی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مزاحمتی کردار ادا کیا، اور مالا گڑھ کی جنگ میں میر ولی داد خاں کی رفاقت میں انگریز فوجوں کے دانت کھٹے کر دیئے جس کی پاداش میں قابل گلاؤٹھوی کے آباء کی جائیداد ضبط کر لی گئی ان کے جد امجد قاضی سید فضل اللہ کو قاضی القضات کے منصب فاخرہ سے برطرف کر دیا گیا۔ اس خاندان نے مغل تہذیب و ثقافت اور زمیندارانہ معاشرت و معیشت کو برقرار رکھا اور ضبط شدہ جائیداد کو خرید کر واگزار کرالیا۔ لیکن جب پاکستان معرض تشکیل میں آ گیا تو قابل گلاؤٹھوی اپنا آبائی وطن چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ جناب منصور عاقل نے لکھا ہے کہ "دہلی سے اولاً جس پرواز کے ذریعے ستمبر ۱۹۴۷ء میں قابل گلاؤٹھوی لاہور پہنچے اس میں ان کے ادبی رفیق خواجہ محمد شفیع دہلوی بھی ان کے ہم سفر تھے اور یہ دونوں ہستیاں عروس البلاد دہلی کی ان ادبی شعری محفلوں کی، یادیں بھی اپنے ساتھ لائیں جن کی رونق سائل، بے خود ،کیفی اور آغا شاعر و جوش ملسیانی جیسی شخصیات پر منحصر تھی" قابل گلاؤٹھوی نے پہلے لاہور کو اور پھر ملتان، بہاولپور، پشاور اور واہ کینٹ کے علاوہ مشرقی پاکستان کے چند مشہور شہروں کو اپنی تخلیقی تازہ کاری اور کلاسیکی مزاج کی شاعری سے متاثر کیا۔

قابل گلاؤٹھوی کی سوچ کے زاویے مثبت تھے، ان کے قول اور فعل میں تضاد نہیں تھا، وہ نانِ جویں پر قناعت کرنے والے ایسے فعال کردار کے شاعر تھے جسے قدرت نے بازوئے حیدر بھی عطا کیا تھا، اور جو مشکلات کا سامنا کر سکتے تھے لیکن اپنی خودی اور خودداری پر حرف نہیں آنے دیتے تھے، ان کے اس مزاج کی تشکیل میں اولاً ان کے خاندان کی وراثت نے اپنا اثر عمل شامل کیا، ان کی تربیت گلاؤٹھی کے دینی مدرسہ "منبع العلوم" میں ہوئی جس کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ ان کے اساتذہ میں مولانا محی الدین، مولانا کریم بخش، صوفی عبدالوحید، اور رحیم الدین جیسے مثالی لوگوں کے نام شامل ہیں جو نصابی تعلیم کے ساتھ اپنے طالب علموں کی شخصیت سازی بھی کرتے تھے، قابل گلاؤٹھوی نے میٹرک کے بعد فاضل اردو، فارسی اور عربی کی مزید اسناد الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کیں اور شاعری کا ریاض جناب عبدالوحید فدا گلاؤٹھوی کی

سرپرستی میں مکمل کیا جو داغ دہلوی کے دبستان کے ایک ممتاز رکن تھے، قابل گلاؤٹھوی کو عبدالوحید فدا کی صاحبزادی سے شادی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس شادی پر ۲۶ ستمبر ۱۹۲۲ء کو گلاؤٹھی کے چھوٹے سے قصبے میں ایک کل ہند شاعرہ منعقد ہوا جس میں اس دور کے بیشتر ممتاز شعرا مثلاً بے خود دہلوی، سائل دہلوی، فانی بدایونی، نوح ناروی، جگر مرادآبادی، احسن مارہروی، بیخود موہانی، امیر گلاؤٹھوی اور مضطر گلاؤٹھوی نے شرکت کی اور اس شادی کو ایک یادگار ادبی تقریب بنادیا۔

قابل گلاؤٹھوی کا پیدائشی نام سید رحیم اللہ تھا، ان کی ولادت ۱۹۰۶ء میں گلاؤٹھی میں ہوئی، اپنے ادبی پس منظر کی وجہ سے انہوں نے ۱۹۲۸ء میں صحافت میں قدم رکھا اور اخبار "الامان" "وطن" "وحدت" "جنگ" اور "قومی گزٹ" کے علاوہ انگریزی اخبار "دی سٹیٹسمین کلکتہ" اور بی بی سی لندن کی نمائندگی بھی کی، قابل گلاؤٹھوی نے صحافت کی اس مصروفیت میں اپنے اندر کے شاعر کو زندہ رکھا۔ چنانچہ ان کے مخصوص کلاسیکی اسلوب کی غزلیں اور خارجی مشاہدے کی اثر انگیز نظمیں اور عقیدت کے دفور میں کہی گئی بے ساختہ نعتیں اور حمدیں رسالہ عالمگیر (لاہور)۔ قوس قزح (لاہور)۔ ادبی دنیا (لاہور) شاعر (آگرہ) ایشیا (میرٹھ) اور نگار (بھوپال) میں شائع ہوتی رہیں میرا ان سے تعارف انہیں رسائل میں ہوا تھا، تاہم ان کی ادبی شہرت کو استحکام و دوام عطا کرنے میں ان کی بدیہہ گوئی کا عمل دخل نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور کمال یہ کہ وہ منظوم گفتگو بھی بڑی روانی سے کرسکتے تھے۔ احسان دانش نے اپنی سوانح حیات "جہان دانش" میں شاعروں میں اپنی بدیہہ گوئی کے کمالات دکھانے والوں کا سرخیل قابل گلاؤٹھوی کو ٹھہرایا ہے۔ اور اپنی طبیعت کی روانی کا ذکر انہوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے:

صف بہ صف شکرِ افکار ہو مَیں جا قابلؔ شعر کہنے کا کبھی میں جو ارادہ کرلوں

قابل گلاؤٹھوی کو ۱۹۴۵ء میں حکومت ہند نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں مشیر کے طور پر مقرر کیا لیکن انگریزی سرکار کی نوکری ان کے مزاج کے خلاف تھی، دوسرے اس وقت تحریک

پاکستان پورے برصغیر میں پھیل چکی تھی، تو تشکیل پاکستان کی خدمت اور تعمیر کا مثبت جذبہ لے کروہ پاکستان آئے تو لٹے پٹے مہاجرین کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ ان کے فخر و انبساط کا احساس ان اشعار سے عیاں ہے:

مری ہجرت میں بھی اعجاز ایماں کارفرما ہے   دیار کفر سے قلب مسلماں لے کے آیا ہوں
مجھے سفاکئی غارت گراں سے کچھ نہیں شکوہ   کہ لٹ کر بھی متاع دین و ایماں لے کے آیا ہوں

سید منصور عاقل نے جو قابل گلاؤٹھوی کے برادر اصغر اور ان کی پوری زندگی کے شناسا ہیں، لکھا ہے:

"پاکستان میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۲ء میں رحلت تک شاعر (قابل گلاؤٹھوی) کی زندگی سکون و قرار سے محروم اور اضطراری کیفیت کے ایک مسلسل عمل سے دو چار رہی، اس کی وجہ شاید اقدار و روایات اور سماجی و معاشی تبدیلیوں کا شاخسانہ بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس کا سبب نئے نظام حالات میں خود شاعر کی داخلی شکست و ریخت کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔"

واضح رہے کہ پاکستان میں قابل گلاؤٹھوی نے اپنے اندر کی فعالیت اور عمل پیہم کو قائم رکھا اور زندگی کو کامیابی کی ڈھب پر لانے کے لیے متعدد دیانتدارانہ طریقے اختیار کیے، انہوں نے ملتان میں وکٹوریہ پریس قائم کیا اور رسالہ "فاران" جاری کیا۔ پشاور میں قیام کے دوران سرحد برقی پریس نامی ایک مطبع کا انتخاب کیا اور ایک اخبار بھی نکالنا چاہا۔ "زمیندار"۔ "آفاق" اور "سفینہ" جیسے اخبارات کے شعبۂ ادارت میں بھی شامل رہے۔ ۱۹۵۸ء میں مشرقی پاکستان گئے تو مولوی فضل الحق اور مولوی فرید احمد کے ساتھ مل کر "احیائے علوم" کے منصوبے بنائے، وہ آخری مرتبہ مشرقی پاکستان گئے تو مطلع سیاست کو بادو باراں میں گھرا ہوا اور پھر بنگلہ دیش بنتے دیکھا، اس وقت وہ ماڈرن لینگویجز یونیورسٹی کے منصوبے کا ڈول ڈال چکے تھے لیکن انہیں ناکردہ گناہ گرفتار کر لیا گیا اور دو سال تک قید و بند کی صعوبتیں راج شاہی سنٹرل جیل میں برداشت کرنی

پڑیں۔ رہائی کے بعد کچھ عرصہ کراچی میں گزارنے کے بعد وہ مستقل طور پر واہ کینٹ میں آ گئے۔ عمر کے آخری سال میں اکادمی ادبیات پاکستان کو جاگ آئی اور ان کا وظیفہ تین سو روپے ماہوار ۱۹۸۱ء میں مقرر کر دیا۔ جو شاید ۵ جولائی ۱۹۸۲ء کو ان کی وفات تک جاری رہا۔ ایک محبِ وطن قادر الکلام شاعر اس دنیا کو نامساعد حالات میں خیر باد کہہ گیا۔ اس وقت ان کا یہ شعر فضا میں گردش کر رہا تھا۔

شرمندہ ہوں قابلؔ میں بہت اپنے ہنر سے   مٹی میں ملایا مجھے ناقدریِ فن نے

قابلؔ گلاؤٹھوی اردو غزل کی کلاسکی روایت کے شاعر تھے، انہوں نے میر تقی میرؔ، مومن خاں مومنؔ اور مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کا مطالعہ بالاستعیاب کیا تھا لیکن ان کا مشاہدہ بیسویں صدی کا تھا جو صنوبر کی طرح پابہ گل ہو کر گرد و پیش کی زمینی حقیقتوں کو منکشف کر رہے تھے اور وہ باغِ جہاں میں صنوبر ہی کی طرح آزاد بھی تھے اور ذہن کی پرواز کو عمودی سمت میں جانے کی اجازت دیتے تو آفاق کے در کھل جاتے، اور قافیہ اور ردیف کی قیود اور ریزہ خیالی کے ہیئتی اسلوب کے باوجود ان کی غزل ابرِ گہربار بن جاتی اور آب و گل کا جہاں لفظ کی معنویتوں کی کائنات بن جاتا۔

ادھر ذہنِ رسا سے فکر کے چشمے ابلتے ہیں   اُدھر جلوے مرے اشعار بن بن کر مچلتے ہیں

اس قسم کے مقامات پر جب تخلیقی وفور معرضِ وجود میں آتا ہے تو قابلؔ گلاؤٹھوی ماورائی حدوں تک پہنچ جاتے ہیں اور اپنا آئیڈیل بھی پا لیتے ہیں:

اندازِ فکر مومنؔ و غالبؔ دیا مجھے   قابلؔ خدا نے بخش کے مجھکو زبانِ میرؔ

یہ حقیقت بڑی عجیب محسوس ہوئی کہ قابلؔ گلاؤٹھوی مفاہیم کی جدت کا اظہار اپنے مخصوص موسیقی ریز اسلوب میں اور اپنے پسندیدہ قافیوں اور ردیفوں کی بندش سے کر رہے ہیں لیکن صریرِ خامہ جو نوائے سردش سنا رہا ہے اس میں میر مومن اور غالب کا آہنگ موجود ہے اور ان کی غزل طویل ہونے کے باوجود تمام کی تمام انتخاب اور معجزہ فن نظر آتی ہے اور حقیقت کے مخفی زاویے روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے مصرعے کے اسرار دوسرے مصرعے میں کھلتے ہیں تو

معنی کا نیا جلوہ برآمد ہوتا ہے۔ اب یہاں قابل گلاؤٹھوی کے کمال فن کے چند منتخب نمونے پیش کرنے کو میرا جی چاہ رہا ہے۔

جب سے سرزد ہوئی تقصیر نظارہ مجھ سے — میری آنکھوں میں مقید مری بینائی ہے

میں صہبائے فنا کے جام بھی منہ سے لگالوں گا — ذرا پیمانہ عمر رواں کو تو تہی کر لوں

آپ کو عشق ہوا، آپ کو معلوم نہیں — اک ستارہ سا یہ کیسا سرمژگاں ٹوٹا

آہِ سوزاں تھی، بھڑکتا شعلہ — میرے اشکوں نے بجھائی آواز

قابل گلاؤٹھوی کی تربیت مذہب کے گہوارے میں ہوئی تھی، انہوں نے غزل کی پامال زمینوں کو تازہ کاری عطا کی تو اپنے مذہبی رجحانات کی بجا آوری کے لیے حمد، نعت اور منقبت کہی اور دین اسلام سے اپنی شیفتگی کا ثبوت فراہم کیا۔

قابل، حمد و نعت کہوں — کیا میں کیا میری اوقات

حمد کے اشعار میں اپنے ایقان کا اظہار یوں کیا:

سر وہی سر ہے کہ جس سر میں ہو سودا تیرا — دل وہی دل ہے جو سو جاں سے ہو شیدا تیرا

بغیر اذن کوئی پتہ ہل نہیں سکتا — جہاں میں کتنا مؤثر نظام ہے تیرا

نعت نگاری میں ان کا یہ اعتراف بے مثل ہے:

قابل اب اپنا دل ہوا حرف شناس مصطفےٰ — اب نہ مری زباں زباں، اب نہ مرا بیاں بیاں

یہ گزرا کہہ کے چمن سے کوئی صبا کی طرح — کہ ایک بندہ نظر آتا ہے خدا کی طرح

گناہ دُھل گئے قابل کے آپؐ کے در پر — وہ روسیاہ پلٹ کر جو لالہ فام آیا

ان کی اس نعت کو پڑھتے ہوئے ہونٹ آپس میں نہیں ملتے:

اللہ کی رضا ہے اطاعت رسول کی ۔۔۔ عرفانِ حق کی راہ ہے الفت رسول کی
تسکین جان و دل ہے قناعت رسولؐ کی ۔۔۔ کہتے ہیں جس کو فقر ہے دولت رسول کی

قابلؔ کی ایک خوبصورت نعت کے دامن میں دو قافیے عقیدت کی جلوہ نمائی کرتے ہیں:

دیکھی سحر کے رخ میں صباحت رسول کی ۔۔۔ زلفوں سے شام نے جو ملاحت قبول کی

دم بھر نہ ماسوا کی اطاعت قبول کی ۔۔۔ محبوب حقؐ نے رکھی وہ حرمت اصول کی

قابل گلاؤٹھوی نے سلام اور منقبت میں بھی اپنی عقیدت کے بہت سے آبگینے مؤلف و مرتب کیے ہیں۔

عقل کی آگہی علیؓ، عشق کی روشنی علیؓ ۔۔۔ ضیغم کبریا علیؓ، زور یدِ الٰہی علیؓ

کوئی ہوا نہ ہو سکے، جیسا ہے حق نما حسینؓ ۔۔۔ شکر کا ارتقا حسینؓ، صبر کی انتہا حسینؓ

اے طلعتِ شہادت عظمیٰ ترے نثار ۔۔۔ تجھ کو عروس خلد بنایا حسینؓ نے

قابل گلاؤٹھوی نے اپنی باشعور زندگی کے تمام ماہ سال عروس سخن کو اپنے اشعار سے سنوارنے میں گزارے۔ لیکن وہ اپنے مسودات کی حفاظت نہ کر سکے۔ ایک روایت کے مطابق ان کے کم و بیش ستر مسودات نظم و نثر مشرقی پاکستان کے ہنگامہ دار و گیر میں گم ہو گئے، ان میں ایک غیر منقوط دیوان بھی تھا۔ تاہم غنیمت ہے کہ ان کے برادر عزیز سید منصور عاقل نے قابل گلاؤٹھوی کا دس ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل دیوان ....''دبستان قابل'' کے عنوان سے چھاپ دیا ہے۔ گویا ان کی نشاۃ ثانیہ برپا کر دی ہے۔ ادبی دنیا ان کی شکر گزار ہے کہ یہ قیمتی کلام دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو گیا۔

محمد عباس

تہذیبی اشتراک میں ادب کا کردار

اقصائے عالم میں آباد اور بسنے والے اربوں انسان فطری طور پر زبانوں، تہذیبوں اور ثقافتوں میں تقسیم ہیں، یہ نظام قدرت ہے اور اس نظام کے تحت یہ کائنات چل رہی ہے، اس کائنات کا سب سے اہم عنصر انسان ہے۔ معروف فلاسفر اور تاریخ دان وِل ڈیوران کے مطابق بنی نوع انسان کی مصدقہ تاریخ تین ہزار چار سو سال (۳۴۰۰) پرانی ہے اور اس طویل عرصہ میں صرف دو سو سڑسٹھ سال (۲۶۷) ایسے گزرے ہیں جن میں دنیا کے کسی حصے میں بنی نوع انسان کے درمیان جنگ نہ ہوئی ہو۔ اگر جنگ یا ہتھیاروں کا استعمال تاریخ میں جاری رہا ہے تو انسان کے درمیان اچھے اور پرامن تعلقات اور باہم تہذیبی و ثقافتی اشتراک کے لئے بھی انفرادی اور اجتماعی کرششیں جاری وساری رہی ہیں مختلف تہذیبوں، ثقافتوں ملکوں قوموں، تمدنوں اور طبقات سے تعلق رکھنے والے ایسے لوگ بھی مصروف کار رہے ہیں جو تہذیبی اشتراک امن وسلامتی، محبت اور اخوت کا پیغام دیتے آرہے ہیں۔ ان لوگوں میں فلاسفر مصلحین، اللہ کے پیغمبر ادیب وشاعر اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے فن کار شامل ہیں۔ انسانوں کے درمیان تہذیبی اشتراک کو فروغ دینے میں ادیان عالم کے بعد ادب نے اہم ترین کردار ادا کیا ہے شرط یہ کہ ادیان، انکی صحیح روح اور ان کے آفاقی نظام پر عمل کیا جائے اور مذاہب کو انسانوں کے درمیان فاصلے پیدا کرنے اور خود غرضانہ سیاسی اور معاشی مقاصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے اور مذہب اور دین کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان فاصلے نہ پیدا کئے جائیں۔

ادب وثقافت شروع ہی سے انسانوں کے درمیان ذہنی، سیاسی اور تہذیبی فاصلے کم کرنے میں کوشاں رہے ہیں۔ موجودہ دور میں تعلیم وتربیت اور ذرائع ابلاغ میں توسیع وترقی اور رسل ورسائل میں انسان کی بے مثال ترقی نے وقت کی طنابیں کھینچ دی ہیں اور جغرافیائی فاصلے

بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔اس صورت حال نے بنی نوع انسان کی معلومات میں بے حد اضافہ کیا ہے اور ہم اپنے گرد و پیش اور دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات سے تیزی کے ساتھ آگاہ ہو جاتے ہیں تاہم گذشتہ زمانوں میں بھی ادیب، شاعر اور فن کار سب کے سب اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتے آرہے ہیں ۔ہم برطانیہ کو شکسپیئر ،ورڈز ورتھ او دیگر فنکاروں، شاعروں اور ادیبوں کے حوالے سے جانتے ہیں ہمیں برطانیہ اور فرانس یا دوسرے ملکوں میں ہونے والی جنگوں سے بہت کم دلچسپی ہے۔ہم ایران کو حافظ سعدی اور فردوسی اور اس ملک کے دوسرے ادباء اور شعراء کے حوالے سے جانتے ہیں۔پاکستان کی پہچان علامہ اقبال ہیں اور فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور ہمارے دیگر معروف شعراء اور ادیب ہیں۔

ادب نے ہمیشہ انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی ہے ادب ایک آفاقی پیغام کا حامل ہوتا ہے ٹالسٹائی ہو یا جان پال، سارتر ہو، مجوبے ہو یا فرانز ہو یا ابوسعید ابوالخیر سب کا ایک ہی پیغام ہے کہ سب انسان اللہ تعالی کے بنائے ہوئے ہیں ۔اور بقول علامہ اقبال دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے۔ادب کے کردار کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ہمیں مختلف تہذیبوں سے آگاہی دیتا ہے اور دنیا میں بسنے والے انسانوں کی معاشرتی سماجی اور ثقافتی اقدار کا شعور دیتا ہے ۔انسان تمام دنیا میں بنیادی طور پر ایک جیسے ہیں سب کے دکھ، خوشیاں، غم فکر و مسائل ایک جیسے ہیں احساسات نقطہ نظر، رویوں اور طرز تفکر میں بہت زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ادب کا مقصد یہی ہے کہ وہ اس ہم آہنگی کو فروغ دے اور انسانوں کے درمیان فاصلے کم کرے۔ادیب شاعر اور فن کار انسان کے ترجمان ہیں۔مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے ادیب اور شاعر بنی نوع انسان کا مشترکہ سرمایہ ہیں اور معاشرے میں خیر کے عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں ۔یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے مقاصد مادی نوعیت کے نہیں ہوتے وہ خیالات اور نظریات کے پرچار اور انسانوں کے درمیان افہام و تفہیم کے داعی ہوتے ہیں ۔بنی نوع انسان کی تاریخ گواہ ہے کہ ادب اور ادیبوں نے انسانوں کے درمیان نہ صرف فاصلے کم کیے ہیں بلکہ انسانی

رشتوں کو استوار اور مضبوط کیا ہے وہ تہذیبوں اور ملکوں کے درمیان اہم رابطے کی حیثیت رکھتے ہیں۔علامہ اقبال پاکستان اور ایران کے درمیان رابطے کا اہم ذریعہ ہیں۔این میری شمل پاکستان اور جرمنی کے درمیان اہم ثقافتی رابطہ ہیں۔لاتعداد ادیبوں اور شاعروں کو عالمی سطح پر انسان کے مشترکہ سرمایہ کی حیثیت حاصل ہے علی پور کا ریلی ،آگ کا دریا ،اینا کرینینا ،اشکنسلا ٹامس گرے کا مرثیہ۔شیکسپیئر کے ڈرامے ایسی تخلیقات ہیں جو عالمی سطح پر انسانی مسائل اور احساسات کی ترجمان اور عکاس ہیں۔کلیلہ ودمنہ، جانور خانہ(Animal Farm)منطق الطیر ،الف لیلہ وغیرہ لافانی تخلیقات ہیں جو انسانی معاشرہ کی عکاس ہیں اور انہیں آج بھی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

لن یوتانگ کی کتاب جینے کی اہمیت (Importance of Living) پیران ولف کا مضمون (Living as a Fine Art) مونالیزا اور مانی اور بہزاد کی تصاویر جیسی لافانی تخلیقات نے انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے ادب اور ادیب امن و سلامتی ،محبت باہمی احترام اور اعلیٰ انسانی قدروں کے داعی اور علمبردار ہوتے ہیں۔اور بالواسطہ اور بلاواسطہ صحت مند معاشرہ کے لئے عمر بھر کوشاں رہتے ہیں اور انسانی تہذیب کو آگے بڑھاتے ہیں وہ زندگی کی خوبصورتیاں ہمارے سامنے لاتے ہیں۔سویڈن کا انسان اور جنوبی افریقہ کا انسان ایک ہیں سب اللہ کی مخلوق ہیں سب کی خواہش اور تمنائیں بنیادی طور پر ایک ہی ہیں اور دنیا بھر کے ادیب وشاعر اور فن کار آس + آدرش کے پرچارک ہیں۔وہ انسان کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کیلئے راستوں کی نشاندہی کرتے ہوئے تہذیبی اشتراک کیلئے ماحول سازگار بناتے ہیں۔ انسانوں کے درمیان باہمی افہام و تفہیم ۔۔۔قریبی رابطوں اور بقائے باہمی کیلئے بنیادی عنصر ہیں اور اس افہام و تفہیم کیلئے اپنے فن کے ذریعے ادیب شاعر دنیا کے انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں محبت کا درس دیتے ہیں اور اللہ کی بنائی مخلوق کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔

نوید ظفر

نندنا

چکوال کے جنوب میں ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر اور چواسیدن شاہ سے بیس کلومیٹر دور میلوں وسیع اراضی کے بیچ باغوانوالہ کے خوبصورت و سرسبز گاؤں میں اچانک ایک ہزار فٹ اونچا ٹیلا ابھرا ہوا ہے۔ زمینی ماہرین کا خیال ہے کہ اس ٹیلے میں کسی قدیم بستی کے آثار ہو سکتے ہیں تاہم اس ٹیلے کی بلندی پر ایک قدیم قلعے اور مندر کے آثار پائے جاتے ہیں۔ جو کم از کم ایک ہزار پندرہ سو برس کے درمیان ہیں، عظیم مسلمان فاتح سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۲۴ء میں اس قلعہ کو فتح کیا تھا۔ محمود غزنوی کے سپاہیوں کی قبریں بھی اس بلند ٹیلے پر محفوظ ہیں اور برصغیر پاک و ہند میں قدیم ترین قبریں سمجھی جاتی ہیں۔

نندنا کا قلعہ البیرونی کے حوالے سے بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ابوریحان البیرونی محمود غزنوی کے درباریوں میں سے ایک تھا، نندنا قلعہ کی فتح کے بعد اس نے چار برس نندنا میں قیام کیا۔ اور اس دوران دو تصانیف مرتب کیں، ایک ''کتاب الہند'' اور دوسری ''قانون مسعودی'' جس میں اس نے زمین کا قطر دریافت کیا تھا۔ اس مقصد کے لئے محمود غزنوی نے البیرونی کو خصوصی طور پر نندنا میں ایک رصدگاہ یا Observatory تعمیر کر کے دی تھی۔ اس رصدگاہ کے آثار بھی نندنا کے ٹیلے پر پائے جاتے ہیں۔

البیرونی پہلا جغرافیہ دان ہے، جس نے نندنا کا عرض بلد ۳۲ دریافت کیا تھا، جو ایک ہزار برس گزر جانے کے باوجود بھی درست ہے۔ سروے آف پاکستان کے مطابق نندنا کا عرض بلد ۳۲،۴۳ اور طول بلد ۱۴،۳۷ ہے۔ پیمائش کا فرق فارمولے کی غلطی کے بجائے جگہ کے مختلف مقام کا انتخاب ہے۔ چنانچہ نندنا کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلا عرض بلد اور

طول بلد، نندنا کے مقام پر متعین ہوا تھا۔

زمین کا قُطر دریافت کرنے کے لئے البیرونی نے سب سے پہلے نندنا پہاڑی کی بلندی ناپی جو اپنی بنیاد سے ۱۸ء۱۰۵۵ فٹ بلند ثابت ہوئی، پھر اس نے نندنا سے دریائے جہلم اور دریائے چناب کے درمیان کوٹ مومن کے مشرق تک تیس میل پر نشان لگایا۔ دوسرا نشان دریائے چناب پر ساٹھ میل کا فاصلہ طے کرنے پر لگایا۔ تیسرے مرحلے میں البیرونی دریائے ستلج کے کنارے بورے والی پر پہنچا اور ۱۲۰ میل دور سے نندنا تک پیائش کی۔ چوتھے مرحلے میں البیرونی نے اپنی پیائش کو مزید وسعت دی اور ۲۵۰ میل دور فورٹ عباس تک پہنچ گیا۔ فاصلے بڑھتے گئے اور البیرونی راجھستان کے صحراؤں تک پہنچ گیا۔ البیرونی کی یہ تمام پیائش اس کی تصنیف قانون مسعودی میں محفوظ ہیں۔

اس پیائش کے لئے البیرونی کو بہت سے حسابی فارمولے ایجاد کرنا پڑے۔ جن میں سائین (Sine) اور ٹینجنٹ (Tangent) کی لوگرتھم جدول بھی شامل ہیں۔ جنہیں اس نے سات سے دس اعشاریہ تک تلاش کیا۔

زمین کا قُطر دریافت کرنے کے لئے البیرونی نے نندنا کی چوٹی کی پیائش ایک ڈگری کے ۳۴ منٹ پر کی، پھر اس نے ۳۴ منٹ کی مقدار معلوم کی اور اس طرح زمین کا نصف قطر دریافت ہوا، جو ۷ء۳۹۸۷ میل بنا۔ اب خط استوا کی پیائش آسان ہوگئی۔ چنانچہ البیرونی کی پیائش کے مطابق خط استوا کی لمبائی ۹۲ء۲۴۷۵۷ ہے۔ چونکہ البیرونی کے زمانے میں یعنی آج سے ایک ہزار برس قبل زمین کی پیائش کی کوئی متبادل جامع پیائش موجود نہیں تھی، اس لئے البیرونی کی تحقیق پر کئی سو سال تک مزید کام نہ ہوسکا۔

گزشتہ صدی میں زمین کی پیائش کے بارے میں حتمی لمبائی کا یقین ہوا۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء کی زمینی پیائش کے مطابق خط استوا کی لمبائی ۳ء۲۴۸۷۳ میل بیان کی گئی جبکہ نصف قُطر کی پیائش ۸ء۳۹۵۸،۷ میل ثابت ہوئی۔ اس طرح البیرونی اور اس کے ۹۵۰ برس بعد ہونے والی

پیمائش میں خط استوا کا فرق ۱۱۵،۸۳ میل اور نصف قطر کا فرق صرف ۲،۰۱ میل ثابت ہوا۔

البیرونی کے علم او تحقیق کے حوالے سے ممتاز دانشور ابوالکلام آزاد نے ''البیرونی کا علمِ جغرافیہ'' تصنیف کی، ابوالکلام کی تحقیق کے مطابق زمین کا قطر ۳۸۵۸ ۲۴۸۵۸ میل ہے۔ جو البیرونی کی پیمائش سے صرف ۸۹ میل زیادہ ہے اس حوالے سے بیرونی کی پیمائش میں غلطی کی شرح ۱۹،۰ فیصد ہے۔

ابوالکلام کی بحث کے مطابق ایک ہزار برس پہلے زمین کے بارے میں عام تصور یہ تھا کہ زمین گیند کی طرح گول ہے۔ جبکہ موجودہ تحقیق کے مطابق زمین خطِ استوا پر پھیلی ہوئی اور قطبین پر پچکی ہوئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۰ء کے Collier Encyclopaedia کے مطابق خطِ استوا کی لمبائی ۲۴۹۰۲ میل اور شمالاً جنوباً قطبین کے گرد زمین ۲۴۸۶۰ میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ یعنی خطِ استوا کی جانب زمین شمالاً جنوباً پیمائش سے ۴۲ میل زیادہ ہے جغرافیہ دانوں کی ایک تحقیق یہ بھی ہے کہ زمین اپنے حجم پر پھیل رہی ہے۔ اگر اب تحقیق کو درست مان لیا جائے تو ممکن ہے کہ گزشتہ ایک ہزار برس میں زمین ۸۹ میل پھیلی ہو، اور اس طرح البیرونی کی تحقیق مزید درست ثابت ہو سکے۔

نندنا کے مقام پر زمین کا قطر دریافت کرنا البیرونی کا واحد عالمی کارنامہ نہیں، نندنا کی چوٹی پر بسنے والوں کو پانی کی فراہمی میں دقت ہوتی اور انہیں روزانہ ایک ہزار فٹ نیچے اتر کر پہاڑی کی تہہ میں بہتے ہوئے چشمے سے پانی حاصل کرنا پڑتا۔ البیرونی نے شہر کے لوگوں کی مشکلات دور کرنے کے لئے نندنا پہاڑ کی بلندی پر دو کنوئیں کھدوائے۔ جن سے پانی برآمد ہوا۔ ایک ہزار فٹ بلند پہاڑ کی چوٹی پر کنوئیں کے ذریعے پانی حاصل کرنا آج بھی محیر العقول کارنامہ ہے۔ اس دونوں کنوؤں کے نشانات آج بھی موجود ہیں۔

نندنا محمود غزنوی کے عہد تک پنجاب کا دارالحکومت رہا۔ بعد میں محمود غزنوی نے لاہور کو فتح کر کے، اپنا مشہور غلام ایاز یہاں بطور گورنر متعین کیا اس طرح نندنا کی تمام شان و شوکت لاہور منتقل ہوگئی جو آج بھی قائم ہے۔

نندنا سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر پنڈ دادنخان کا تاریخی شہر ہے جسے ۱۶۲۳ء میں کھوکھر حکمران دادن خان نے دریائے جہلم کے کنارے تعمیر کروایا تھا۔ پنڈ دادن خان کی خصوصی وجہ شہرت نمک کی منڈی تھی۔ کھیوڑہ سے کھدائی ہونے والا نمک پنڈ دادن خان تک آتا اور پھر دریائے جہلم عبور کر کے میانی تک پہنچتا۔ جہاں سے ملک کے باقی حصوں تک پہنچایا جاتا۔ تاہم ریل کا نظام رائج ہو جانے سے نمک کھیوڑہ کی کانوں سے براہ راست ریل کے ذریعہ ملک کے تمام حصوں میں پہنچ جانے سے پنڈ دادن خان اور میانی کی اہمیت جاتی رہی۔ پنڈ دادن خان کی ایک اور وجہ شہرت راجہ غضنفر علی خان کی ذات ہے' جو پاکستان کی پہلی کابینہ میں قائداعظم اور قائد ملت لیاقت علی خان کے ساتھ وفاقی وزیر منتخب ہوئے تھے۔

پنڈ دادن خان کے قریب جلالپور کا قدیم اور تاریخی شہر دریائے جہلم کے کنارے آباد ہے' جلالپور شہر کا موجودہ نام جلال الدین اکبر کے حوالے سے ہے' تاہم شہر کی تاریخی اہمیت قدیم شہر گرجھک کی بدولت ہے جہاں یونانی حملہ آور سکندر نے دریائے جہلم عبور کر کے مقامی راجہ پورس سے جنگ لڑی تھی۔ سکندر اعظم کے حملے کی یاد میں یہاں ایک یادگار بھی تعمیر کی گئی ہے۔

انگریز محقق کننگم نے گرجھک شہر کی تاریخ قدیم ہندو روایات رامائن کے دور میں گرورامجا شہر سے منسلک کی ہے۔ جلالپور جو گرجھک کا موجودہ نام ہے چشتی سلسلہ کے بزرگ پیر حیدر شاہ کے مزار کے حوالے سے بھی شہرت رکھتا ہے۔

جلالپور سے چودہ کلومیٹر کے فاصلے پر دلاور کا تاریخی شہر آباد ہے' دلاور کی تاریخ بھی ہزاروں برس قدیم بتائی جاتی ہے' یہاں سے سا کا عہد کے سکے بھی برآمد ہوئے ہیں' دریائے جہلم کے کنارے دلاور شہر کا قدیم نام اودے نگر بتایا جاتا ہے' جسے ہندو عہد میں راجا بھارتی نے آباد کیا تھا۔

رپورتاژ

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران

اُردو تحقیق وتنقید عالمی تناظر میں

(فیصل آباد میں منعقدہ بین الاقوامی اُردو کانفرنس کی روئیداد)

جی سی یونیورسٹی فیصل آباد ایک بالکل نئی یونیورسٹی ہے، لیکن اگر اسے ماضیء بعید کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک ایسا تعلیمی ادارہ سامنے آجائے گا جس کی عمر فیصل آباد یعنی لائل پور شہر سے کم نہیں، اسکول سے شروع ہو کر انٹر، ڈگری اور پوسٹ گریجویٹ کالج اور پھر اب جی سی یونیورسٹی بننے تک کے عمل میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ یہ ادارہ ہمیشہ اپنے شہر کے لیے عزّ و وقار کی علامت بنا رہا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں گورنمنٹ کالج لائل پور میں پوسٹ گریجویٹ سطح کے مطالعات کا آغاز ہوا، ان میں ایم اے اُردو بھی شامل تھا۔ مجھے اس عظیم ادارے کے ساتھ طالب علم اور استاد دونوں حیثیتوں سے وابستہ رہنے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہاں کے شعبہ اُردو میں اساتذہ کی ایک کہکشاں آباد رہی ہے، اسّی کی دھائی کے اواخر میں جب شعبہ اُردو میں بطور لیکچرار آیا تو پروفیسر ڈاکٹر انور محمود خالد صدر شعبہ تھے ،ان کے علاوہ پروفیسر عصمت اللہ خان، پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید، پروفیسر ڈاکٹر ریاض احمد ریاض، ڈاکٹر احسن زیدی، پروفیسر منظر مفتی، پروفیسر عبدالرحمٰن شاکر، پروفیسر ذوالفقار بخاری، ڈاکٹر سردار علی، پروفیسر افتخار بخاری، پروفیسر اشفاق بخاری، پروفیسر یعقوب مظہر گل، پروفیسر امین آسی اور افضال احمد انور شعبہ کی رونق تھے۔ اب یہ سب کچھ تاریخ کا حصہ ہے۔ کچھ اساتذہ ریٹائر ہو گئے کچھ اپنے اللہ کے پاس چلے گئے۔ جی۔ سی یونیورسٹی کا شعبہ اُردو بھی اب یونیورسٹی کی طرح ایک نیا شعبہ ہے، اساتذہ نوجوان ہیں، پُرعزم ہیں اور ان کے ساتھ پون صدی کی شاندار روایت ہے، یہی لوگ اور یہی ادارہ ہو سکتا تھا کہ جو اُردو تحقیق وتنقید کو عالمی تناظر میں پرکھنے کیلئے ایک عالمی کانفرنس کا خواب دیکھتا اور اس خواب کو حقیقت

میں تبدیل کرتا۔ یہ سب کچھ نہایت سرعت سے ہوا۔ میں اس کانفرنس کی آرگنائزنگ کمیٹی کا رکن ہونے کی حیثیت سے جملہ مراحل، معاملات اور مسائل سے واقف رہا ہوں، امر واقعہ یہ ہے کہ اس کانفرنس کے کامیاب اور بامراد انعقاد نے جہاں جی سی یونیورسٹی اور شہر کی توقیر میں اضافہ کیا ہے، وہاں اُردو زبان وادب اور اس حوالے سے دنیا بھر میں ہونے والے تحقیقی وتنقیدی کام کی مختلف جہات کو موضوع بنا کر ایک وسیع تر علمی مکالمے کا آغاز بھی کیا ہے۔ مجھے متعدد کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا ہے، لیکن جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کی سہ روزہ بین الاقوامی اُردو کانفرنس تین وجوہ سے منفرد نظر آئی، پہلی یہ کہ تین دنوں میں کل چالیس مقالہ نگاروں نے شرکت کی، جن میں سے تیرہ مقالہ نگار بیرون ملک سے تشریف لائے تھے، یہاں پاکستان کی اُردو زبان وادب کی تدریس وتحقیق سے وابستہ جملہ یونیورسٹیوں کے نمائندے موجود تھے، تین دن سب اکٹھے بھی رہے لیکن کوئی رنجش، اختلافی بحث یا منتظمین کے لیے ندامت کا باعث بننے والی ناراضگی پیدا نہیں ہوئی۔ پاکستان کے حوالے سے یہ اہم بات ہے دوسری وجہ مقالہ نگار حضرات کا کانفرنس کے تمام اجلاسوں میں موجود رہنا ہے۔ کوئی ایک اجلاس بھی ایسا نہیں کہ جس میں تمام ملکی وغیر ملکی اسکالرز موجود نہ رہے ہوں۔ اور تیسری اہم وجہ اُردو سے بطور زبان اور بطور تہذیب کے شدید وابستگی اور محبت کا برملا اظہار ہے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی تین جامعات سے چھ اسکالرز شرکت کیلئے تشریف لائے تھے ان میں دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر عبدالحق، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی سے ڈاکٹر ایم شاہد حسین، ڈاکٹر ابن کنول اور ڈاکٹر خواجہ اکرام، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹر ایس ایم ہاشم اور بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے استاد ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے شامل ہوئے۔ ایران سے دو اسکالرز علی بیات اور محمد کیومرثی نے شرکت کی۔ جاپان کی نمائندگی پروفیسر ہیروجی کتاؤ کانے کی مصر کی جامعہ الازہر سے ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم، ترکی سے ڈاکٹر جلال سویادان جب کہ اٹلی کی میلان یونیورسٹی سے ڈاکٹر دیتو سیلیر نیو اور جرمنی سے ایگزل مونٹے کانفرنس میں شامل ہوئے۔ پاکستانی اسکالرز میں کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر سحر انصاری اور ڈاکٹر تنظیم الفردوس، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر روبینہ ترین اور ڈاکٹر قاضی

عابد، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ڈاکٹر شفیق احمد، ڈاکٹر نجیب جمال، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر، ڈاکٹر سلیم مظہر، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر فخر الحق نوری، مرغوب حسین طاہر کانفرنس میں شریک ہوئے۔ لاہور ہی سے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے بھی کانفرنس میں شرکت کی، پشاور یونیورسٹی سے ڈاکٹر صابر کلوروی اور ان کے ساتھ ڈاکٹر خالد خان خٹک کانفرنس میں شرکت کیلئے تشریف لائے جب کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی نمائندگی کا اعزاز میرے حصے میں آیا اسلام آباد ہی سے ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی اور ممتاز نقاد حمید شاہد بھی کانفرنس میں شریک ہوئے افتتاحی اور اختتامی تقاریب کے علاوہ اس سہ روزہ کانفرنس میں کل چھ اجلاس حسب ذیل ترتیب سے منعقد ہوئے۔

۲۹۔اگست ۲۰۰۶ء۔۔بروز منگل۔۔پہلا سیشن ۲٫۰۰ تا ۴٫۳۰ (بعداز دوپہر)

صدارت: ڈاکٹر عبدالحق (دہلی)

مہمانِ خصوصی: ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر (لاہور)

۱۔ محمد کیومرثی۔۔بیسویں صدی کے نصف اوّل میں لکھے جانے والے اُردو اور فارسی افسانے کا تقابلی جائزہ

۲۔ ڈاکٹر جلال سویادان۔۔ترکی میں اُردو تحقیق اور تنقید کی پیش رفت

۳۔ ڈاکٹر محمد سلیم مظہر۔۔اُردو زبان و ادب پر فارسی کے اثرات

۴۔ ڈاکٹر سحر انصاری۔۔متنی تنقید

۵۔ ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی۔۔۔اُردو کی تشکیل میں فارسی کا حصہ

پہلا دن ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء۔۔بروز منگل۔دوسرا سیشن۔۔۵٫۰۰ تا ۷٫۳۰ (شام)

صدارت۔ ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی (اسلام آباد)

مہمانِ خصوصی۔ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی)

۱۔ علی بیات۔۔چند اہم اُردو تراجم ایک مطالعہ

۲۔ مرغوب حسین طاہر۔۔۔اُردو کا آغاز اور لسانی محققین

۳۔ پروفیسر ہیرجی کتاؤکا۔۔۔دیوانِ غالب کا جاپانی زبان میں ترجمہ

۴۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔۔۔جامعات میں تحقیق

دوسرا دن ۳۰ اگست ۲۰۰۶ء۔ بروز بدھ۔ پہلا سیشن۔ ۱۰:۰۰ تا ۱۲:۳۰ (قبل از دوپہر)

صدارت۔ ڈاکٹر انوار احمد (ملتان)

مہمانِ خصوصی۔ ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم (جامعۃ الازہر مصر)

مہمانِ اعزاز۔ ڈاکٹر آصف اقبال خان (وائس چانسلر جی۔سی۔ یونیورسٹی فیصل آباد)

۱۔ ڈاکٹر تنظیم الفردوس۔۔۔اُردو میں ساختیاتی تنقید۔۔جواز اور امکانات

۲۔ محمد حمید شاہد۔۔۔اُردو افسانہ اور تنقید عالمی تناظر میں

۳۔ ڈاکٹر قاضی عابد۔۔۔برصغیر کی جامعات میں تنقید کا خوف

۴۔ ڈاکٹر معین الدین جینابڑے۔۔۔ولی شناسی تحقیق وتنقید کی روشنی میں

دوسرا دن ۳۰۔ اگست ۲۰۰۶ء۔ بروز بدھ۔ دوسرا سیشن۔ ۲:۰۰ تا ۴:۳۰ (بعد از دوپہر)

صدارت۔ ڈاکٹر ریاض مجید (فیصل آباد)

مہمانِ خصوصی۔ ڈاکٹر جلال سویادان (ترکی)

۱۔ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران۔۔۔پاکستان میں مطالعہ و تحقیق اقبال۔ ماضی، حال اور مستقبل

۲۔ ڈاکٹر روبینہ ترین ۔۔۔جامعات میں تحقیق اقبال کی روایت

۳۔ ڈاکٹر ایگزل مونٹے Iqbal an urdu poet, language and national identity

۴۔ ڈاکٹر نجیب جمال۔۔۔اقبال کمالِ فن کی مثال

۵۔ ڈاکٹر عبدالحق۔۔۔اقبال شناسی کے مختلف زاویے

۶۔ ڈاکٹر ویتوسیلیر نیو۔ Research work on Iqbal in Italy.

تیسرا دن ۳۱۔اگست ۲۰۰۶ء۔ بروز جمعرات۔ پہلا سیشن۔ ۱۰:۰۰ تا ۱۲:۳۰ (قبل از دوپہر)

صدارت۔ڈاکٹر نجیب جمال (بہاول پور)

مہمانِ خصوصی۔ڈاکٹر شفیق احمد (بہاول پور)

۱۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام۔۔سائبر سپیس اور اردو تدریس

۲۔ ڈاکٹر صابر کلوروی۔۔ادبی تحقیق میں معیاری سٹائل شیٹ کی تیاری

۳۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن۔۔اردو مرثیے کے نئے ابعاد

۴۔ ڈاکٹر محمد شاہد حسین۔۔۔اُردو ڈرامے کی تحقیق و تنقید۔عالمی تناظر میں

۵۔ ڈاکٹر سید محمد ہاشم۔۔ہندوستان میں عصرِ حاضر میں تحقیق و تدوین

۶۔ ڈاکٹر فخر الحق نوری۔۔جاپان میں اُردو۔لغت نویسی کے تناظر میں

تیسرا دن ۳۱ اگست ۲۰۰۶ء۔ بروز جمعرات۔دوسرا سیشن ۲:۰۰ تا ۴:۳۰ (بعد از دوپہر)

صدارت۔ ڈاکٹر انور محمود خالد (فیصل آباد)

مہمانِ خصوصی۔ڈاکٹر فخر الحق نوری (جاپان)

۱۔ ڈاکٹر شفیق احمد۔۔۔اُردو اور اس کے متروک الفاظ

۲۔ ڈاکٹر ابنِ کنول۔۔۔دانش گاہوں میں تحقیقی سمت اور رفتار

۳۔ ڈاکٹر انوار احمد۔۔۔پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کا اعتبار اور استناد

۴۔ ڈاکٹر ریاض مجید۔۔آن لائن ڈیجیٹل لائبریری کے قیام کی ضرورت و اہمیت

۵۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل۔۔۔جامعات میں تحقیق کا فروغ اور صورتِ حال

کانفرنس کے ان چھ اجلاسوں میں کل تیس مقالے پڑھے گئے۔دس مقالے وقت کی کمی کے باعث پیش نہیں کیے جا سکے۔لیکن ان مقالوں کے ملخص اور مکمل مقالے کانفرنس میں پیش کیے جانے والے مقالات کی کتاب میں شامل کیے جائیں گے۔

کانفرنس کا مرکزی موضوع اُردو و تحقیق و تنقید، عالمی تناظر میں، میں تھا، جب کہ ذیلی

موضوعات میں تحقیق، تدوین، تنقید، مخطوطہ شناسی، غالب شناسی، اقبال شناسی، لسانیات اور ترجمہ شامل تھے۔ کانفرنس میں پیش کیے جانے جملہ مقالات ان تمام جہات کا احاطہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تُرکی کی انقرہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر جلال سویادان پاکستانیوں کی طرح اردو بول رہے تھے۔ ان کے رواں اور شستہ لہجے نے مجھے حیران کیا وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ استاد محترم (شاید ایسا وہ مزاح پیدا کرنے کیلئے کہہ رہے تھے) اردو اور ترکی زبانیں قریباً ساٹھ فی صد ایک جیسی ہیں، ترکی زبان کا رسم الخط تبدیل ہونے کی وجہ سے ان دونوں زبانوں کی قربت نظر انداز کر دی گئی، لیکن اگر آج بھی ترکی زبان عربی رسم الخط میں لکھ کر کسی پاکستانی کو پڑھنے کیلئے دے دی جائے تو وہ کافی کچھ سمجھ جائے گا۔ ڈاکٹر جلال سویادان ترکی وجاہت، شرافت اور شائستگی کا عمدہ نمونہ نظر آئے، ہر وقت مسکراتے رہتے تھے، جب بے تکلفی زیادہ ہوگئی اور ہم باقاعدہ دوست بن گے۔ تو انہوں نے بتایا کہ ٹھیک ایک ماہ پہلے ان کی شادی ہوئی ہے۔ اپنے موبائل فون پر انہوں نے اپنی تقریب عروسی کی چند تصاویر بھی دکھائیں میں نے مبارک باد دی اور دوسروں کے نجی معاملات میں دخل دینے کی ایشیائی روایت کے عین مطابق پوچھ لیا کہ شادی اب کیوں کی !(مراد یہ کہ اتنی دیر سے کیوں کی) تو ہنس کر کہنے لگے اس سے پہلے مجھے محبت نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر جلال سویادان کا مقالہ ترکی میں اردو زبان کے ماضی حال اور مستقبل کا احاطہ کرتا تھا۔ یہ دلچسپ، معلومات افزاء اور بعض حوالوں سے چشم کشا مقالہ تھا۔ اس مقالے کے بعض نکات پر نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جلال سویادان نے اپنے مقالے میں بتایا کہ ترکی میں اردو زبان و ادب اور تنقید و تحقیق کا باقاعدہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب ترکی کی تین یونیورسٹیوں میں اُردو زبان و ادب کے شعبے قائم ہوئے اور باقاعدہ تدریس ہونے لگی۔ اُردو کا پہلا شعبہ ۱۹۵۶ء میں انقرہ یونیورسٹی میں قائم ہوا اور اسی سال حکومتِ پاکستان کی طرف سے اس شعبے میں اُردو چیئر قائم ہوئی اور اس چیئر پر پروفیسر داؤد رہبر کا تقرر ہوا۔۔ ان کے بعد وقفے وقفے سے ڈاکٹر طاہر فاروقی مرحوم، ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر عبادت بریلوی

مرحوم، ڈاکٹر اے بی اشرف، ڈاکٹر انوار احمد اور ڈاکٹر سعادت سعید چیئر پر فائز رہے۔ اس شعبے سے ہزاروں طالب علم فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ سات طالب علموں نے اس شعبے سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ شعبے میں اب تک بیسیوں اردو تحقیق وتنقید کی کتابوں کے تراجم کیے جا چکے ہیں اور سینکڑوں مقالات بی اے اور ایم اے کی سطح پر قلم بند کیے جا چکے ہیں۔ یہ شعبہ خود کفیل ہے اور اب یہاں کے ترک اساتذہ ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد تدریس کے علاوہ تحقیق وتنقید کا کام بھی کر رہے ہیں ۔ ترکی میں دوسرا شعبہ ۱۹۸۵ء میں سلجوق یونیورسٹی قونیہ میں قائم ہوا۔ مشہور محقق اور عالم ڈاکٹر ایرکن ترکمان اس شعبے کے صدر رہے۔ یہاں کے تین سکالرز نے انقرہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں اور اب سب کے سب تدریس کے علاوہ اردو ادب کی ترقی میں اور ترکی ادب کو اردو میں متعارف کرا رہے ہیں۔ ان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین اور تراجم پاکستان کے نامور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تیسرا شعبۂ اردو ۱۹۸۵ء ہی میں استنبول یونیورسٹی میں قائم ہوا۔ شروع میں یہاں اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے شعبۂ فارسی کے ساتھ منسلک کیا گیا۔ اور یہاں چیئر قائم کر کے نامور عالم استاد ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کو بھیج دیا گیا۔ ان کے بعد ڈاکٹر خلیل طوقار نے اس شعبے کا انتظام سنبھالا اور اپنی کارکردگی کے بل بوتے پر یہاں باقاعدہ اردو شعبہ قائم کرایا۔ وہ بھی اردو تنقید و تحقیق کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر جلال صویدان نے اپنے مقالے کے آخر میں ترکی میں مشرقی زبانوں سے عدم توجہی کے رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ " ایک زمانہ تھا جب ترکی میں عربی فارسی اور دیگر مشرقی اور مغربی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب، تنقید و تحقیق کی ترویج کا کام شد و مد سے ہو رہا تھا۔ انقرہ اور قونیہ کے اردو شعبوں میں طلبہ و طالبات کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی تھی۔ قونیہ میں تو شام کی کلاسیں بھی قائم کرنا پڑیں لیکن پھر ترکی کی اقتصادی اور سیاسی مصلحتوں کے تحت حکومتی سطح پر مشرقی زبانوں کی حوصلہ افزائی ختم ہوگئی۔ قونیہ جیسے مشرقی تہذیب میں ڈھلے ہوئے شہر کی یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کی تدریس کا سلسلہ ہی بند کر دیا گیا۔ انقرہ اور استنبول کے شعبہ ہائے اردو میں

بھی اب ہر سال دس دس پندرہ پندرہ طالب علموں سے زیادہ داخلہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی جن سکالرز نے اردو میں پی ایچ ڈی کی ہے وہ اپنی اپنی جگہ اردو تحقیق وتنقید کی ترویج اور پیش رفت میں اپنی سی کوششیں کررہے ہیں۔ البتہ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ترکی میں اردو کا مستقبل روشن یا تابناک ہے۔

ایک واقعہ انہوں نے زبانی بھی سنایا کہنے لگے کہ انقرہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے چند احباب سفیر پاکستان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شعبہ اردو کے دائرہ کار، خدمات، مستقبل کے امکانات اور پاکستان کی طرف سے اردو زبان کی سرپرستی کی آرزو پر روشنی ڈال کر گزارش کی کہ شعبہ اردو کے لیے اردو زبان وادب سے متعلق بعض کتب کی ضرورت ہے اگر آپ تعاون فرمائیں اور پاکستان سے یہ کتابیں منگوالی جائیں تو ہم نہایت شکر گزار ہوں گے۔ سفیر محترم نے جنہوں نے ساری بات توجہ اور شفقت سے سنی تھی، نہایت معصومیت سے پوچھا کہ ان کتب کے لیے ادائیگی کون کرے گا؟ بعض سوال اس طرح ترتیب دیے جاتے ہیں کہ جواب اُن کے اندر ہی چھپا ہوا ہو، یہ سوال بھی اسی قسم کا تھا۔ ڈاکٹر جلال علامہ اقبال اور ترک مفکر شاعر محمد عاکف کی فکری مماثلتوں پر کام کر چکے ہیں اور آج کل اقبال اور محمد عاکف کے زیرِ عنوان ایم فل سطح پر ایک پاکستانی اسکالر کے مقالے کے نگران تحقیق ہیں۔ وہ آج کل دیوانِ غالب کا ترکی زبان میں ترجمہ کرنے میں بھی مصروف ہیں۔ جاپان کے اسکالر پروفیسر ہیرو جی کتاؤکا کا بھی نمایاں ترین کام دیوانِ غالب کا جاپانی زبان میں ترجمہ ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان بھی یہی تھا۔ انہوں نے ان تمام مشکلات کی تفصیل پیش کی جو انہیں اس کام میں پیش آئیں، اساسی نسخہ کا انتخاب اور اس کی وجوہ اور پھر ترجمے کی نزاکتیں اور مسائل۔ ان کے مقالے کو سن کر یہ سوال ذہن میں ابھرا کہ الفاظ کے ترجمہ اور احساس کی ترجمانی کو یکجا کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے؟ پروفیسر ہیرو جی کتاؤکا جاپان کی دیتوبر کا یونیورسٹی کی فیکلٹی آف انٹرنیشنل ریلیشنز سے وابستہ ہیں۔ لاہور میں بیٹھ کر اپنا کام مکمل کررہے ہیں۔ پروفیسر ہیرو جی کتاؤکا اپنی شگفتہ طبیعی، زندہ دلی اور خوش مزاجی کے باعث کانفرنس کے سب سے مقبول غیر ملکی مندوب تھے۔ انہوں نے غالب کی بعض غزلیں اردو

زبان اور جاپانی لہجے میں سنا کر خوب داد سمیٹی ، اور پھر اس کے بعد فیض احمد فیض کی نظم ''دشتِ تنہائی میں ۔۔۔'' اپنے خاص انداز سے سنا کر محفل کو لوٹ ہی لیا۔ ہمارے ایک بزرگ ساتھی نے ایک لمبی سانس کھینچ کر تبصرہ کیا ! اچھا! میں اب سمجھا کہ یہ نظم اقبال بانو نے جاپانی طرز میں کیوں گائی ہے۔ پروفیسر ہیروجی کتاؤ نے اپنے مقالے میں دیوانِ غالب کے جاپانی ترجمے کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ جب میں کہتا ہوں کہ اب دیوان غالب جاپانی زبان میں ترجمہ کر رہا ہوں تو زیادہ تر لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ کون سا دیوان غالب استعمال کر کے ترجمہ کر رہے ہیں؟ میں جواب دیتا ہوں کہ متداول دیوان غالب استعمال کر کے ترجمہ کر رہا ہوں تو وہ دیوان غالب کے کئی اور نسخوں کے نام بتاتے ہیں، اس لیے کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شاید متداول دیوان ترجمہ کرنے کیلئے مناسب نہیں۔ بازار میں کئی طرح کے دیوان غالب ملتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ بھی پہلے سے میں جاننا چاہتا تھا کہ متداول دیوان کس نسخے یا کس سنہ میں شائع کردہ دیوان غالب سے مرتب ہوا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں کئی لوگوں سے پوچھا۔ لیکن مجھے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ لیکن آخر کار مجھے ان سوالوں کا صحیح جواب مل گیا۔

دوسری بات غزلوں کا دیوان مرتب کرنے کے طریقے کے بارے میں ہے جاپان میں شاعری کے مجموعے دیوان کی طرز پر نہیں ہوتے۔ اس لیے دیوان ہمیں بہت عجیب لگتا ہے۔ مثلاً یہ کہ دیوان غالب کے شروع کے حصے میں غزلیں آتی ہیں جو غالب نے اپنی زندگی کے آخر میں کہیں اور یہ بھی ہے کہ جو غزل غالب نے نوجوانی میں کہی وہ دیوان غالب کے آخر میں ملتی ہے۔ اس لیے دیوان غالب پڑھنے سے ہمیں پتہ نہیں چل سکتا ہے کہ غالب اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں کس طرح سوچتا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ غالب نے کس زمانے میں کون سی غزل کہی۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ چند سال پہلے مجھے کالی داس گپتا کا مرتبہ دیوان غالب دستیاب ہوا۔ کتاب کا نام 'دیوانِ غالب' تاریخی ترتیب کے ساتھ ہے۔ اس کتاب کے مطابق میں نے متداول دیوان غالب اور اپنے ترجمہ شدہ دیوان غالب کی سب غزلوں اور نظموں پر تاریخیں لکھ دیں۔ پھر

میں نے کالی داس گپتا کے دیوانِ غالب سے متداول دیوان غالب کا مقابلہ کیا۔

میلان یونیورسٹی اٹلی کے ڈاکٹر وتیوسیلیر نیو ایک سنجیدہ ،خوش لباس اور نفیس پروفیسر نظر آئے۔انہوں نے اٹلی میں اقبال پر ہونے والے تحقیقی و تصنیفی کام پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔انہیں اردو زبان پر بھی مکمل عبور تھا۔اس کا انکشاف بھی اتفاقاً ہی ہوا کیونکہ کانفرنس میں وہ انگلش ہی سے کام چلاتے رہے۔ ہوا یوں کہ اسلام آباد سے فیصل آباد جاتے ہوئے وہ ہمارے ہم سفر تھے۔ راستے میں کلر کہار کے مقام پر قافلہ دو پہر کے کھانے کے لیے رُکا۔شعبہ اُردو کے ڈاکٹر آصف اعوان یونیورسٹی کی گاڑی پر ہم سب کو لینے آئے تھے۔انہوں نے میزبان کے طور پر پوچھنا شروع کر دیا کہ آپ لوگ کیا کیا کھائیں گے۔ قافلے میں چونکہ جرمنی کے اینگزل مونٹے اور ڈاکٹر وتیوسیلیر نیو بھی تھے اس لیے سب انہی کی طرف دیکھتے رہے۔میزبان نے مینو میں لکھی ہوئی تمام ترکانٹینٹل ڈشز نہایت بے آرام انگریزی لہجے میں پڑھ کر سنانا شروع کیں۔ان کا رُخ زیادہ ڈاکٹر وتیوسیلیر نیو کی طرف تھا۔وہ نہایت ادب سے سب کچھ سنتے رہے ڈاکٹر آصف نے تھوڑا سانس لے کر اور پانی کا ایک نامکمل گھونٹ پی کر پھر سے انگریزی پڑھنی شروع کی۔اور ساری ڈشز کے نام پڑھ کر ان کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگے۔اس پر ڈاکٹر وتیوسیلیر نیو کا جواب اب بھی میرے کانوں میں رس گھول رہا ہے'' آپ براہ کرم دال اور چپاتی منگوالیں'' میزبان گھبرا سے گئے اور ہم سب کی ہنسی چھوٹ گئی بعد میں ڈاکٹر وتیوسیلیر نیو نے بتایا کہ وہ کئی برس تک کراچی میں مقیم رہے ہیں اور اُردو روانی سے بول سکتے ہیں۔

ہندوستان سے آئے ہوئے مہمانوں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر سید محمد ہاشم اپنی وضع قطع اور رنگ ڈھنگ کے باعث نمایاں رہے،حضرت سید محمد ہاشم علی گڑھ شیروانی زیبِ تن کرتے اور اسی کپڑے کی ٹوپی (نہرو کیپ جیسی) اور پاجامہ پہنتے تھے۔ اس طرح کہ تینوں دن الگ الگ ،ریش مبارک قدرے دراز ،لیکن کالی سیاہ ،آنکھوں میں صبح سے شام اور شام سے رات گئے تک موجود رہنے والے سرخ ڈورے اور نہایت احتیاط سے لگایا گیا

سرمہ بھی قابلِ توجہ رہا۔نہایت شائشگی سے بات چیت کرتے تھے۔انہوں نے بتایا کہ وہ گزشتہ دس برس سے شعبہ اردو میں اقبالیات کا کورس پڑھا رہے ہیں۔اپنے مقالے میں انہوں نے ہندوستان میں اردو تحقیق وتنقید کی صورت حال کو موضوع بنایا تھا۔

دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالحق نے اپنے مقالے میں ہندوستان میں اقبال شناسی کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈالی۔یہ ایک دلچسپ اور معلومات افزاء مقالہ تھا۔انہوں نے بتایا کہ اقبال کا اثر اقبال سے محبت کرنے والوں اور نہ کرنے والوں پر یکساں ہے دونوں طرح کے تحقیقی وتصنیفی کام میں اس تاثر کی توانائی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان کے استدلال کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ اقبال کی بصیرت نے برصغیر کے اجتماعی ذہن کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ایک مثال انہوں نے یہ بھی دی کہ اقبال کی معروف نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کی تقلید میں ہندوستان میں متعدد ابلیس کی شورائی مجلسیں لکھی جا چکی ہیں۔انہوں نے پانچ نمایاں ابلیس کی شورائی مجلسوں کا ذکر کیا ان میں سے ابلیس کی ایک مجلس کیفی اعظمی نے سجائی اس نظم میں کیفی اعظمی نے اقبال کی لفظیات سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔یعنی جہانِ کاف ونون، زاروزبوں ،شہباز وممولے، رومتہ الکبریٰ، جہانِ آرزو، رنگ وبو، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو وغیرہ۔یہ ۶۰ اشعار کی نظم ہے۔ایک مجلس پروفیسر محمد حسن نے سجائی جس کے کردار کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری اور اختر الایمان ہیں ان کے علاوہ سید غلام سمنانی اور ایک کم معروف شاعر فنا پرتاب گڑھی (مقیم احمد آباد) کی شورائی مجلسوں کا ذکر بھی انہوں نے کیا۔یہ صرف ایک مثال تھی۔انہوں نے یہ بات بتا کر بھی شرکاء کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کیا کہ ہندوستان کے موجودہ وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ اپنے سرہانے کلیات اقبال رکھتے ہیں اور ہر شب سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ ضرور پڑھتے ہیں۔پروفیسر عبدالحق نے اپنی تازہ تصنیف اقبال اور اقبالیات مجھے نہایت محبت سے دی۔اس عمدہ کتاب میں ہندوستان میں ہونے والی اقبال شناسی اور اس کے نمایاں رجحانات پر وقیع اشارے موجود ہیں۔ جو پاکستانیوں کے لیے یقیناً نئے ہیں۔ہندوستانی اسکالرز میں بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے

استاد ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے کا موضوع تو "ولی شناسی میں تحقیق وتنقید" تھا اور اس مقالے کے نمایاں نکات پیش کرنے کے لیے ان کے پاس دس منٹ کا وقت تھا لیکن پندرہ منٹ انھوں نے تمہید میں لگا دیے۔ انھوں نے نہایت ڈرامائی انداز میں آغاز کیا آواز بھی ڈرامہ بولنے والوں جیسی تھی ضیاء محی الدین جیسی تو نہیں، بس اس کے آس پاس۔ کہنے لگے۔ فیصل آباد کو میں لائل پور کے نام سے جانتا ہوں اور بمبئی میں لائل پور شہر میرے ہمسائے میں رہتا تھا۔ میرے لیے لائل پور کا ایک نام سریندر پرکاش بھی تھا میرا ہمسایہ سریندر پرکاش رہتا تو بمبئی میں تھا لیکن بستا لائل پور میں تھا۔ انھوں نے نہایت تاثر انگیز لہجے میں کہا کہ انسان جب اجڑتے ہیں تو شہر ان کے اندر پناہ لے لیتے ہیں۔ تقسیم کے وقت جب سریندر پرکاش نے لائل پور سے ہجرت کی تو اس شہر کو بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ وہ ہندوستان کے کئی شہروں میں گھوما پھرا لیکن لائل پور کی یاد اور سحر نے پیچھا نہ چھوڑا، آخر کار وہ بمبئی میں رہنے لگا۔ اس کا گھر پورے کا پورا لائل پور تھا میں اس شہر میں پہلی بار آیا ہوں لیکن سریندر پرکاش نے میرے ساتھ اس شہر کی اتنی باتیں کر رکھی ہیں کہ میں خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتا ان کے اس انداز توصیف کی خوب داد دی گئی مقالہ بھی عمدہ تھا۔ ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے پرانے لائل پور کو دیکھنا اور دریافت کرنا چاہتے تھے۔ اس مہم میں "لائل پور کہانی" کے مولف پروفیسر اشفاق بخاری نے خضر راہ بننے کی حامی بھری اور پھر ان کے ساتھ ڈاکٹر جینا بڑے نے وہ تمام جگہیں دریافت کر لیں جو ان کے ذہن میں سریندر پرکاش کے حوالے سے محفوظ تھیں۔ بلاشبہ یہ کام پروفیسر اشفاق بخاری ہی کر سکتے تھے۔

کانفرنس کے شرکاء کو شہر کے مرکز میں واقع چناب کلب میں ٹھہرایا گیا تھا۔ رات کو لاونج میں بزم آرائیاں ہوتیں۔ ان میں چند مشاعرے بھی تھے اور غیر ادبی لیکن بصیرت افروز لطائف اور ظرائف بھی۔ ان محفلوں نے سارے مندوبین کو ایک دوسرے سے بے تکلف کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کانفرنس کی اختتامی تقریب میں پنجاب کے گورنر تشریف لائے تھے۔ اس تقریب کی سب سے اہم بات جی سی یونیورسٹی فیصل آباد میں منتو چیئر کے قیام کا اعلان تھا۔

یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر آصف اقبال خان فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ خطرناک حد تک بے خوف اور منظم نظر آئے ! ان کے ساتھ بھی گفتگو رہی موصوف ڈنر کے وقت میرے پاس تشریف لے آتے، انہوں نے جی سی یونیورسٹی کو ایک جدید یونیورسٹی بنانے کے لیے متعدد اقدامات کا ذکر کیا میں نے انہیں بین الاقوامی کانفرنس کے کامیاب انعقاد پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ آپ نے یہ کامیابی دراصل اقبال کا یہ کہا مان کر حاصل کی ہے کہ۔

خرد کو غلامی سے آزاد کر　　جوانوں کو پیروں کا استاد کر

میرا اشارہ شعبہ اُردو کے جملہ نوجوان اساتذہ کی اس ٹیم کی طرف تھا جنھوں نے اس کانفرنس کا اہتمام کیا، خوب ہنسے کہنے لگے میں نے تو ذرا زیادہ احتیاط کرتے ہوئے یونیورسٹی میں پیروں کا داخلہ تک بند کر رکھا ہے بوڑھے صرف باتیں کرتے ہیں جب کہ نوجوان اگر انہیں موقع دیا جائے تو بڑے سے بڑا کام آسانی سے کر جاتے ہیں۔ یہی کانفرنس اگر بوڑھوں کے ہاتھ میں ہوتی تو کئی سال کاغذی تیاریوں سے باہر نہ نکلتی جب کہ ان نوجوانوں نے صرف اڑھائی ماہ میں یہ ممکن کر دکھایا۔ شعبہ اُردو کی صباحت قمر اور رابعہ سرفراز اس نوجوان ٹیم کی قائد تھیں۔ ہندوستان سے آئے ہوئے ایک وضع دار پروفیسر صاحب نے بڑی رازداری کے ساتھ مجھے بتایا کہ بھائی ہم سمجھتے تھے کہ صباحت قمر اور رابعہ سرفراز بڑی بزرگ، جہاں دیدہ اور سرد گرم چشیدہ خواتین ہونگی، لیکن یہ تو بچیاں نکلیں، آپ کے ملک میں نوجوانوں پر اس قدر اعتبار کیا جاتا ہے، ہم تو تو قع نہیں کر سکتے تھے۔

سال ۲۰۰۷ء کے لئے زرِ تعاون کی نئی شرح

(اندرونِ ملک)	(بیرونِ ملک)
فی شمارہ ۸۰ روپے	فی شمارہ (مع محصول ڈاک) ۷ امریکن ڈالر / ۵ برطانوی پاؤنڈ
سالانہ (مع محصول ڈاک) ۳۵۰ روپے	سالانہ (مع محصول ڈاک) ۳۰ امریکن ڈالر / ۲۰ برطانوی پاؤنڈ

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

عوام

یوں تو عوام طاقت کا سرچشمہ ہوتے ہیں لیکن دنیا کی مظلوم ترین چیزیں بھی وہی ہیں۔ طوفان تو ہیں لیکن تہارہ جائیں تو ہوا کا کمزور ترین جھونکا بھی وہی ہیں۔ دنیا میں تعلیم کا تناسب مختلف ہے لیکن موٹی باریک عقلوں کا یوں ایک ساتھ اظہار خیال انھیں اپنی خصوصی عقل سے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کثرت انھیں مضبوط بناتی ہے اور یہی کثرت اور طاقت انھیں کسی ایک نقطے پر قائم نہیں رہنے دیتی۔

سیاست دان عوام کو ہانکنے کا گر جانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بغیر کاریگری کے عوام کے آگے ٹھہرا نہیں جا سکتا۔ ایک پھونک میں اُڑا دیں گے۔ بگڑے تو ان کی بوٹی کا ہزاروں حصہ بھی تلاش نہیں کیا جا سکے گا۔ ہاتھی اور مہابت کا تعلق ہے۔ مہابت منہنی سا ہونے کے باوجود ہاتھی پر اپنی مکمل برتری قائم رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کہاں کون سا گر کارآمد ہو سکتا ہے اور کہاں ڈھیل دی جائے تو ہاتھی کی عقل پھیل کر اس کے پیروں میں ڈھیر ہو جاتی ہے۔ عوام جب جوش میں ہوتے ہیں تو ہوش کھو دیتے ہیں اس وقت ان کی مشترکہ عقل کام کرتی ہے۔ انفرادی طور پر سوچنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی۔ وہ سوچتے ہیں کہ دوسرا ان کے لیے سوچ رہا ہوگا۔ جب سارے ہی اس انداز سے سوچتے ہیں تو رہی سہی عقل بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے پھر نہ جانے کس طرح کہاں سے کوئی جوشیلا آدمی فلک شگاف نعرہ بلند کرتا ہے باقی سارے اسے عزت نفس سمجھ کر دوڑ پڑتے ہیں۔

عقل اور عوام کا ہمیشہ ہمیشہ کا بیر ہے غور و فکر کے معاملے میں عوام کبھی سنجیدہ نہیں ہوتے دوسرے یادداشت ان کی صفر ہوتی ہے۔ جوش و خروش کا ایک ریلا آتا ہے۔ سیلاب کا بند ٹوٹ جاتا ہے اس ٹوٹے بند کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ایسے میں سیاست دان ہی مہارت کا کام کرتے ہیں وہ عوام میں گھس جاتے ہیں ان کی سی ہی حرکتیں کرتے ہیں جب زور کچھ کم ہوتا ہے تو چپکے سے

الگ ہو جاتے ہیں عوام کو مصروف رکھتے ہیں۔ عوام کی حیثیت جن کی سی ہوتی ہے۔ انھیں مصروف رکھنا پڑتا ہے۔ سیاست دانوں کی لغت میں انھیں فریب میں رکھنا ضروری ہے۔ عوام کے تعلقات تعلیم سے بھی واجبی سے ہوتے ہیں اس لیے ان پر زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔

عوام کو ننگی کا ناچ نچایا جاتا ہے اور تھیا تھیا کر کے وہ ناچتے بھی ہیں۔ عوام انفرادیت کے اصولوں سے بے خبر ہوتے ہیں انھیں گھمانا اور فریب میں مبتلا کرنا قدرے آسان ہے۔ لوگ عوام کی طاقت سے اپنے ذاتی کام لے لیتے ہیں۔ عوام ظالم سماج بھی بن جاتا ہے دہشت گردی سے بھی نہیں چوکتا۔ چنگیز خان کی لاکھوں فوج نے عوام کا کردار ادا کیا تھا چنگیز خان عقل مند آدمی تھا عوام نما عوام کی لگام ہر وقت اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ عوام کٹتے بھی تھے اور مرتے بھی تھے وہ جگہ خالی نہیں چھوڑتے تھے وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رکھتے تھے لگام جدھر گھمائی جاتی وہ سب ادھر ہی گھوم جاتے تھے۔

عوام سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں وہ اچھے برے کی تمیز اس صورت میں کرتے ہیں کہ ان کا پیش رو کیا چاہتا ہے۔ عوام کا بھیڑ چال سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ اگر پہلی بھیڑ جان کر یا غلطی سے کنویں میں گر جاتی ہے تو اسکے بعد آنے والی ساری بھیڑوں کا یہی حشر ہوگا، عوام کی فطرت اسی اصول پر کام کرتی ہے۔

جمہوریت اور عوام کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جمہوریت میں سروں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا۔ جمہوریت کا پہلا شکار عوام ہوتے ہیں۔ جس طرح عورت کو بے لگام آزادی کا خواب دکھا کر ننگا نچایا جاتا ہے۔ وہ جان جان کر دھوکا کھاتے ہیں اسے وہ سیاسی جمہوری عمل تصور کرتے ہیں۔

عوام کی یادداشت قابل رحم حالت تک کمزور ہے۔ وہ انفرادیت اور عقلی دلیل سے الرجک ہوتے ہیں وہ نہ سن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں۔ جدھر کا ریلا آتا ہے بغیر کسی جدوجہد کے اُدھر ہی لڑھک جاتے ہیں۔

عوام کی حالت سیلاب کی سی ہے جس طرح سیلاب ہمیشہ نشیب کا انتخاب کرتا ہے عوام کی بھی وہی فطرت ہے۔ بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتے ہیں۔ انھیں اپنی غلطی کا احساس آخر

وقت تک نہیں ہوتا۔ تکلیف، پریشانی، الجھن، گھٹن، مصیبت وہ اس طرح برداشت کرتے ہیں جیسے وہ اپنے اس مقدر کے لکھے کو پہلے سے جانتے ہیں۔ عوام سماجی ٹھیکیدار بھی ہوتے ہیں اس ٹھیکیداری میں وہ جتنے بھی ظلم کر سکتے ہیں اپنا فرض سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ عوام کی ایک خصوصیت اور بھی ہے جو انھیں کشاں کشاں لیے پھرتی ہے وہ یہ کہ وہ کوئی بھی عمل کریں نہ پہلے سوچتے ہیں نہ بعد میں اور حد تو یہ ہے کہ مسلسل زک اٹھانے کے بعد بھی وہ بے نیازی کو اپنا شعار بنائے رکھتے ہیں۔

عوام اور افواہوں کا دیرینہ تعلق ہے۔ تحقیق سے وہ خائف رہتے ہیں جو بے پر کی اڑانے میں مزہ ہے وہ تحقیق میں کہاں جب تحقیق کا نام سنتے ہیں تو سوچتے ہیں ان کے سیلاب کو روکنے کے لیے بند باندھے جا رہے ہیں پھر ان کا واحد مقصد اس بند کو بہالے جانا ہی ہوتا ہے۔ وہ پچھتانا بھی نہیں جانتے۔ ان کے حوصلے کبھی پست نہیں پڑتے سیاست دانوں کو ان کی یہی ایک ادا بہت بھاتی ہے ان کے ہاتھ میں عوام کی نکیل تو ہوتی ہی ہے جب چاہتے ہیں زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے لگوا لیتے ہیں۔ نعرے عوام کو مستی میں لانے کا منتر ہے جب وہ مستی میں ہوتے ہیں تو بولنا، سننا، سمجھنا، محسوس کرنا ان پر سب کچھ حرام ہو جاتا ہے۔ جو منحرف ہوتا ہے وہ پاؤں تلے روندھا جاتا ہے۔ مٹی میں ملا دیا جاتا ہے۔ اس کی خاک تک باقی نہیں بچتی۔ جس طرح سیلاب ہر بات سے بے نیاز ہوتا ہے عوام بھی اسی فطرت کے تحت عمل کرتے ہیں۔

عوام کو جب اور جہاں جی چاہے لڑایا جا سکتا ہے۔ طوفان برپا کیا جا سکتا ہے۔ راستے میں آنے والی ہر چیز فنا کروائی جا سکتی ہے لیکن ایسا بھی ہوا ہے پورس کے یہ ہاتھی کبھی کبھی اپنی ہی فوج کو روندھ ڈالتے ہیں۔ اسے وہ جذبہ حریت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس جذبے کی تعریف کرتے ہوئے کسی نے کہا تھا بڑھتے ہی چلو، کٹتے ہی چلو بازو بھی بہت سر بھی بہت عوام کے سر اور بازو اتنے سستے ہیں کہ انھیں بے دریغ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

عوام جب بھڑکتے ہوئے شعلے ہوتے ہیں تو کیا چنگیز خاں، کیا ہلاکو، کیا ہٹلر، کیا مسولینی سب منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے ان ہی عوام میں سے کچھ عقل و شعور کی

بات کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ اتنے کمزور اور بے بس ہوتے ہیں کہ اس سیلاب کو وہ روک نہیں سکتے اور اسی میں عافیت تصور کرتے ہیں کہ وہ خود اس ریلے میں بہہ جائیں اور جو ایسا نہیں کرتے سقراط بننے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ زہر ہی نہیں پیتے اپنی خاک سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

خواص اس غم میں زیادہ گھلتے ہیں کہ انھیں کہیں عوامی دائرے میں شمار نہ کر لیا جائے وہ عوام کو محکوم کا درجہ دیتے ہیں وڈیرہ اوپر کرسی پر بیٹھ کر فیصلے صادر کرتا ہے اور سارے لوگ زمین پر بیٹھ کر گردن جھکا کر صرف سنتے ہیں۔ محض اس لیے کہ وہ عوام ہیں۔ وڈیرہ زمین پر نہیں بیٹھ سکتا اگر وہ زمین پر بیٹھ گیا تو عوامی جراثیم کا شکار ہو جائے گا۔ عوام بادشاہ کی رعیت ہوتے ہیں انھیں جو بھی حکم ملتا ہے اسے وہ پورا کرتے ہیں۔

عوام انقلاب لا سکتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے لائے ہیں خواص کے لیے یہ بڑی کسمپرسی کا وقت ہوتا ہے وہ اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے ہیں عوام کو لوریاں دے دے کر سلاتے ہیں اور وہ جب مقدر کی پوجا کر رہے ہوتے ہیں خواص پھر اپنا سنگھاسن سنبھالتے ہیں۔

عوام پر قابو پانے کے مختلف طریقے ہیں۔ ان میں احساسِ محرومی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بے روزگاری عام کی جا سکتی ہے۔ گرانی کے پہاڑ توڑے جا سکتے ہیں۔ پھوٹ اور نفاق کے بیج بوئے جا سکتے ہیں نفسیاتی تجربے کیے جا سکتے ہیں۔ ذہنوں کو مفلوج بنایا جا سکتا ہے۔ ایسے حالات پیدا کیے جا سکتے ہیں کہ شکم پُر کرنے اور تن ڈھانکنے میں مصروف رہ کر اپنی شخصیت کو مسخ کر سکیں۔

عوام ایک ایسا تخت ہے جو عوام کے سروں پر رکھا ہے اور عقل مند بیٹھ کر حکومت کر رہے ہیں عوامی کیفیت کا احساس دلا کر نفسیاتی طور پر ذلت کی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا جاتا ہے عوام ایسی آگ اور طوفان بھی ہیں، جب اکھڑ جاتے ہیں تو خطرناک طوفان بن جاتے ہیں لیکن اس کا بھی توڑ موجود ہے۔ تاریخ کے اوراق الٹیے عوام آج بھی عوام ہی ہیں وہ چکّی میں پس کر بھی خوش ہیں وہ اپنی محرومیوں اور معذوریوں کا مذاق اڑانے کی اہلیت رکھتے ہیں یہ تاریخ کا طویل سلسلہ ہے اور سلسلے جاری رہنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔

بشیر حسین ناظم

حمدِ حق جل مجدہ

کس کے کرم سے دودۂ آدم ہے ارجمند
کس کی عطا سے پایہء انسان ہے بلند

کس کے حضور جن و بشر سجدہ ریز ہیں
کس ذات کے ہیں جملہ پیمبر نیاز مند

کس کی ضیا ہے طلعت اقمار و کہکشاں
کس کی پھبن کا عکس ہے دنیائے چون و چند

کس نے عطا کیے ہیں سرور و طرب، خوشی
ہیں کس کا عُو د شادی و عشرت، نشاط و خند

کس کی رضا کا نور فروزاں ہے قلب میں
کس کی ثناء میں محو ہے ہر جان مستمند

یہ عقل، یہ خرد، یہ تیقن ہے کس کا دان
ہے کس کا فیض، میل عبادات و نصح و پند

ڈالی ہے کس نے خلق کے دل پر بصد کرم
اپنی صفات و ذات کے عرفان کی کمند

چلتا ہے کس کے حکم سے کار حیات و مرگ
ہیں عرش و فرش کس کی ہدایت پہ کاربند

فرحاں ہے کس کے امر سے آہوئے زندگی
رمنائے مدح و حمد میں بھرتا ہوا زقند

کس کی اطاعتوں میں ہے توقیر آدمی
کس کی نظر میں شرک و تمرد ہے ناپسند

ہے کس کا ذکر روح فسردہ کی تازگی
کس کی ثناء ہے شکر و مصری، نبات و قند

ہیں کس کے امتثال میں عقبیٰ کی فرحتیں
ہے کس کی سرکشی میں زیاں و ضرر، گزند

پویاں رہے تصور ابد تک اگر مدام
کنہہ کو اس کی پا نہ سکے عقل کا سمند

ناظم سے حمد ہستی واجب محال ہے
کیا آفتاب، کیا شرر دانہ سپند

محمود رحیم

حمد

اگرچہ کتنی گنہگاریوں میں رہتا ہوں
پر اس غفور کی غفاریوں میں رہتا ہوں

زمانہ مجھ کو کبھی بے لباس کر نہ سکا
میں تیری ذات کی ستاریوں میں رہتا ہوں

تمام عالم امکاں سرائے فانی ہے
ہمیشہ کوچ کی تیاریوں میں رہتا ہوں

ترے سوا مرا دست طلب کہیں نہ اٹھے
میں اپنی ذات کی خودداریوں میں رہتا ہوں

کھلا ہے آیہء ''لاتقنطو'' کا جب مفہوم
رحیم تب سے گنہگاریوں میں رہتا ہوں

ارشد محمود ناشاد

نعت

وہ کیا جہاں ہے جہاں سب جہاں اُترتے ہیں
وہ کیا زمیں ہے جہاں آسماں اُترتے ہیں

ترے چمن سے خزاں کا گذر نہیں ہوتا
ترے چمن میں گُلِ جاوداں اُترتے ہیں

بس ایک بار وہ شہرِ جمال دیکھنا ہے
جہاں پہ مہر و مہ و کہکشاں اُترتے ہیں

نگاہِ شوق نے خوابوں میں جن کو دیکھا ہے
بیاضِ دل سے وہ منظر کہاں اُترتے ہیں

خدا کا شکر کہ نسبت ہے اُس دیار کے ساتھ
پئے سلام ملائک جہاں اُترتے ہیں

عبدالعزیز خالد

بحضورِ سرورِ کائناتؐ

تو برگزیدہ تریں فردِ نوعِ آدم ہے
ہو جس قدر بھی ثنا گستری تری کم ہے

ترے کمال کی ہر آن، آن بان نئی
ترے جمال کا ہر لحظہ تازہ عالم ہے

طلیعہ صبحِ بہاراں کا طلعتِ تاباں
سیاہی شب دیجور، جعد پُرخم ہے

ترا اشارۂ ابرو ہے مدِ موجِ طرب
تری نگاہِ کرم کیمیا ہے، مرہم ہے

ترے حصار میں بے ساختہ کھنچا آئے
ہر ایک آہوئے رعنا کہ خوگررم ہے

ہزار رنگ ترے، بے شمار انگ ترے
تو برقِ ابر کا شعلہ ہے، ابر کا نم ہے

احاطہ کس سے ہو اوصافِ بےکراں کا ترے؟
ترے مقام و مکارم کا کون محرم ہے؟

تو راست باز ہے ناقابلِ یقیں حد تک
براق و ساز ترا حمد، حمد پرچم ہے

بجھائے پیاس تو اپنی جس آبخورے سے
اس آبخورے سے شرمندہ ساغرجم ہے

مراد سوختگاں، مدعائے زندہ دلاں
ہر اہلِ درد کا تو ہم نوا و ہمدم ہے

مسافرانِ رہ حق کو تیرا نقشِ قدم
نوشتۂ طلبِ صادق و مصمم ہے

ترا کلام بہ سرکوبی ابوجہلاں
مثالِ طیر ابابیل، فوجِ اشرم ہے

ہمارے قولِ مزخرف ہیں عاطل و باطل
تری زباں سے جو نکلے وہ حرف محکم ہے

ہر ایک نکتے کو کرتا ہے کھول کر تو بیاں
ہے تہ بہ تہ ترا مضموں پہ غیر مبہم ہے

"حسب نسب ہے تشخص نہ منصب و دولت
بذاتہ جو ہے قابل وہی مکرم ہے

فلاحِ کار ہے وابستہ سعیِ پیہم سے
نشاطِ زیست کدو کاوشِ دمادم ہے !"

"پیمبر آئے گا، من بعدی اِسمہٗ احمد"!
یہ تیری شان میں اعلانِ ابنِ مریمؑ ہے

مُسیلمہ کو لقب دیں : "نبی سوء کا
کہ تو تمام محمدؐ تو وہ مذمّم ہے

ترا بیاں ہے "علی الانبیاء فُضّلت" !
سر اس بیاں کی صداقت کے سامنے خم ہے

قوام کون و مکاں، زبدۂ زمین و زماں
حجابِ ہر دو جہاں، تو نبی خاتمؐ ہے

نزول جس کا ہوا تجھ پہ وہ پیام حیات
بلامبالغہ منشورِ امنِ عالم ہے

"لیظھرہ علی الدین کلّہٖ" بے شک
فضیلت اس کی سب ادیان پر مسلم ہے

شب مکاشفہ روح القدس نے مجھ سے کہا
"کہ اسم پاک محمدؐ ہی اسم اعظم ہے"

بقدر شوق جو دم بھر سکے ترا خالدؔ
مجال و حوصلہ اس میں کہاں، کہاں دم ہے!

سید مشکور حسین یاد

نعت

ملیں گے محمود حق ہیں آقا ﷺ ایاز جاں سے ایاز جاں تک
سوال یہ ہے کہ ناز اٹھاؤ نیاز جاں سے نیاز جاں تک

حضور ﷺ کا نام کیا لیا ہے بہت بڑا کام سر کیا ہے
پگھل گئے ہیں پہاڑ غم کے گداز جاں سے گداز جاں تک

حساب کیجئے تو عرش اتریں گے ان گنت جسم و جاں پہ جاناں
نہ جانے کتنے فلک ہیں فائز فراز جاں سے فراز جاں تک

ہم اپنے دل کو سنبھالیں کیسے بحالیں کیسے نہالیں کیسے
حقیقتیں ہی حقیقتیں ہیں مجاز جاں سے مجاز جاں تک

کہاں ہے ممکن کہ اک نظر بھی ہم اپنا نظارہ آپ کرلیں
کروڑوں نقش و نگار جاں ہیں طراز جاں سے طراز جاں تک

مزاج معراج رخ ہمارا جو ہے نبی ﷺ و علیؑ کا صدقہ
تو قابِ قوسین کی فضا ہے نماز جاں سے نماز جاں تک

تمام دنیا ہے میرے آقاؐ کی دید میں یاد عید ساماں
تمام عالم سمٹ گئے ہیں حجاز جاں سے حجاز جاں تک

سہیل غازی پوری

نعت

میں گزاروں جو کبھی آپ ﷺ کے در پر لمحے
کاش ہو جائیں وہ صدیوں کے برابر لمحے

دیکھنے کے لئے سرکار ﷺ کو معراج کی شب
اپنے محور سے نکل آئے تھے باہر لمحے

صرف اک غار حرا ہے کہ جہاں صدیوں سے
ہیں دھنک رنگ اجالے تو معطر لمحے

اب جو ٹھریں گے تو ٹھریں گے در آقا ﷺ پر
میرے ہمراہ چلے ہیں یہی کہہ کر لمحے

جانے کب سے در آقا ﷺ پہ صدا دیتے ہیں
ہاتھ میں کاسہ لئے مثل قلندر لمحے

یاد رنگ سحر و شام مدینہ کے سبب
میری پلکوں پہ چمکتے ہیں منور لمحے

میں بھی سرکار ﷺ کی دہلیز پہ بیٹھا ہوں سہیل
دے دیئے وقت نے مجھ کو بھی وہ بہتر لمحے

جمیل یوسف

صلی اللہ وعلیہ وسلم

آزادی اک لفظ تھا
اس کو معنی نہیں ملے تھے
آزادی اک لفظ تھا
جیسے حرفوں کی بے جان لکیریں
کس کو خبر تھی
آزادی کیا شے ہے
ذہن غلامی کی تہ در تہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے
بے خبری کی لاعلمی کی اور جہالت کی زنجیریں
گم راہی کی اور ضلالت کی زنجیریں
اندھی، گونگی، بہری طاقت کی زنجیریں
زنجیریں تھیں حرص وہوس کی، ظلم وستم کی
دولت کی خود غرضی کی
زنجیریں تھیں نام ونسب کی
انسانوں اور حیوانوں میں فرق نہیں تھا
یہ دنیا بس دو پاؤں اور چوپاؤں کا اک جنگل تھا
جانوروں کی اک بستی تھی
انساں کیا ہے
کس کو پتہ تھا

سوچ اور فکر کو جکڑے ہوئے تھیں
ظلم وجہالت کی زنجیریں
میرے آقاؐ
آپؐ نے آکر
یہ ساری زنجیریں توڑیں
میرے آقاؐ
آپؐ نے آکر
آزادی کے لفظ کو معنی بخشے
میرے آقاؐ آپؐ نے آکر
انساں کو تکریم عطا کی
میرے آقاؐ
آپؐ نے آکر
انسانوں پر کتنا بڑا احسان کیا ہے
کتنا بڑا احسان کیا ہے
میرے آقاؐ
میرے محمدؐ
صلی اللہ وعلیہ وسلم
صلی اللہ وعلیہ وسلم

ثمر بانو ہاشمی

منقبت' جناب فاطمہ زہراؑ سلام اللہ علیہ

آج کا دن ہے مبارک اور سعید
مومنوں کے واسطے ہے روز عید

خانہ ء احمد میں وہ چٹکی کلی
اور دامانِ رسالت میں پلی

اُس کی پیدائش ہوئی وجہ نشاط
تھا نبیؐ کے رخ پہ رنگِ انبساط

اس سے مہکا گلستانِ مصطفےٰؐ
وہ سراپا حسنِ سیرت باحیا

وہ جو آغوشِ رسالت میں پلی
زیرِ قرآں تربیت اُس کی ہوئی

اُس کی سیرت' اس کی صورت لاجواب
سیدہ زہرا ملا اُس کو خطاب

عفت و عصمت کی وہ تصویر تھی
شمع وحدت کی وہ اک تنویر تھی

ذات اُس کی چشمہ ایمان تھی
وہ مجسم عاملِ قرآن تھی

خُلق میں قرآن کی تفسیر تھی
وہ نبیؐ کی ہو بہو تصویر تھی

مرضیہ اور راضیہ اُس کا لقب
وہ سراپا علم و تہذیب و ادب

آسیہ' مریم کی صورت نیک نام
عورتوں میں وہ ملا اس کو مقام

خانہ ء حیدر کا وہ روشن چراغ
اس سے مہکا احمدؐ مرسل کا باغ

اس کو خاتون جناں حق نے کہا
مادر حسنین کا رُتبہ ملا

اس کی گودی میں پلے وہ ماہ رُو
جن سے ہے دین ہدیٰ کی آبرو

اس طرح فرمائی تعلیم حسن
بن گئے شفاف سورج کی کرن

اس طرح کی تربیت شبیر کی
اک مکمل شخصیت تعمیر کی

عورتیں زہرا کا دم بھرتی رہیں
سیدہ کی پیروی کرتی رہیں

ان کے کردار ان کی سیرت پر چلیں
فاطمہ زہرا کے سانچے میں ڈھلیں

اے ثمر توفیق یہ حاصل رہے
اُن کا نقش پا مری منزل رہے

اکبر حیدرآبادی

☆

بند آنکھوں سے ہر اک شے کا سراپا دیکھوں
جو دکھائی نہیں دیتی ہے وہ دنیا دیکھوں

ہوسِ زر نے جلا رکھی ہیں شمعیں کیا کیا!
کبھی اِن آنکھوں میں چاندی، کبھی سونا دیکھوں

اپنی مٹھی میں دبا رکھی ہیں موجیں اس نے
ریت تو ریت سمندر کو بھی پیاسا دیکھوں

کھینچ لی چادرِ آب اپنی طرف دریا نے
میں بھی بیکل تھا کہ ساحل کو برہنہ دیکھوں

مجھ کو ترتیب الٹ دینے کا فن آتا ہے
خواب سے پہلے ہی تعبیر کا چہرہ دیکھوں

جشنِ سورج کا مناتے ہیں سبھی لوگ، اور میں
جس طرف دیکھوں فقط سایہ ہی سایہ دیکھوں

سینہ ء سنگ میں ذرات کی ہلچل اکبر
منجمد آب میں بہتا ہوا دریا دیکھوں

☆

سلسلہ وار کہکشاں ہیں بہت
بے گماں اور بھی جہاں ہیں بہت

ایک خاموش جنگ جاری ہے
ہے زمیں ایک آسماں ہیں بہت

یہ امیروں کا شہر ہے شاید
یہاں ٹوٹے ہوئے مکاں ہیں بہت!

دیر ہے بس زباں کے کھلنے کی
لوگ آمادۂ فغاں ہیں بہت

میں ہوں جس شہر میں، وہاں میرے
ہم نظر کم ہیں ہم زباں ہیں بہت

شہر خوباں ہے، ہونہو یہ شہر
دل جلوں کے یہاں مکاں ہیں بہت!

تم کو اکبر خبر نہیں -- تم میں
خوبیاں کم خرابیاں ہیں بہت

سید مشکور حسین یاد

☆

ہمارے اشک جو بارانِ ذات انڈیلتے ہیں
خرد کے شیشے میں تازہ صفات انڈیلتے ہیں

ہماری پیاس کا عالم ہے دیدنی گرچہ
ہم اپنی فتح پہ کھل کر فرات انڈیلتے ہیں

ہمارا جامِ جنوں کیسے خالی ہو اس میں
بڑے ثبات سے ہم بے ثبات انڈیلتے ہیں

ذرا جو سننے میں تاخیر کرتے ہیں احباب
تو کان کان میں ہم کائنات انڈیلتے ہیں

وہ اپنے حرف کو رکھتے ہیں ہر طرح شاداب
جو خامشی پہ خُم ممکنات انڈیلتے ہیں

ہماری صبح یونہی تابناک ہوتی نہیں
کسی کے چہرے پہ زلفوں کی رات انڈیلتے ہیں

محاسبہ کوئی مشکور کیفِ کشف نہیں
ہم ایک نکتہ پہ سو سو نکات انڈیلتے ہیں

☆

ایک اک اشک شمار و تو ہے بات
یوں ستاروں میں گذارو تو ہے بات

غیر کو خواہنا ہے کیا مشکل
خود کو شیشے میں اتارو تو ہے بات

خاک کی خاک اڑاتے کیوں ہو
بحر بہتان بہارو تو ہے بات

شر کو شرمندۂ شہرت نہ کرو
خیرو خوبی کو شرارو تو ہے بات

جوش کو ہوش میں کیا لانا ہے
ڈوبتے تارے طرارو تو ہے بات

چھپنے والوں کو کہاں ڈھونڈو گے
آشکاروں کو شکارو تو ہے بات

بازؤں میں چلے آئیں کونین
یاد یوں خود کو حصارو تو ہے بات

ڈاکٹر خیال امروہوی

☆

حرف اجلے ہیں سحر پاش صدا ہے اپنی
مختصر یہ کہ جدا سب سے نوا ہے اپنی

کون تولے گا ہمیں فن کی ترازو لے کر
عہد سفاک میں اب قدر بھی کیا ہے اپنی

فکر امروز پہ طاری ہے گزشتہ کا زوال
کل کے بارے میں جو سوچیں تو قضا ہے اپنی

شامیانے میں وہ بیٹھے جسے سایہ نہ ملے
چتر شاہی سے کہیں بڑھ کے ردا ہے اپنی

مرحلہ وار لٹایا ہے وفاؤں کا نکھار
اس خسارے میں ہی پوشیدہ بقا ہے اپنی

کیسے محفوظ ہو عریانی سے قامت کا وقار
قد کے معیار سے محدود قبا ہے اپنی

ڈاکٹر انور سدید

☆

ذہن کے قفل کو تدبیر سے اب کھولا ہے
بطنِ سیپ کو تحریر سے اب کھولا ہے

جانے پہلے مجھے کیوں یہ نہیں محسوس ہوا
جو تاثر تری تصویر نے اب کھولا ہے

استعاروں میں خیالات کو ہے ڈھال لیا
ذائقہ اک نیا تحریر نے اب کھولا ہے

گم شدہ راستہ شاید اسے مل ہی جائے
اس نے نقشہ بڑی تاخیر سے اب کھولا ہے

پابہ جولاں تھا جو قیدی وہ اچانک بولا
راستہ زیست کا زنجیر نے اب کھولا ہے

دل کی تنویر میں جب میرؔ پڑھا تو انورؔ
کیف انوکھا، غزل میرؔ نے اب کھولا ہے

مضطر اکبرآبادی

☆

روشنی تیرا مقدر ہے اندھیرا میرا
ایسے حالات میں کیا ساتھ ہو تیرا میرا

سب مظاہر ہیں ترے سارے مناظر ہیں ترے
نہ کوئی شام ہے میری نہ سویرا میرا

روز ایک زخم نیا کھا کے پلٹ آتا ہوں
روز لگتا ہے گلی میں تری پھیرا میرا

اب تو ہوں ایک زمانے سے نہال بے برگ
ہاں کسی دور میں سایہ تھا گھنیرا میرا

اب خد و خال سے ظاہر ہیں تھکن کے آثار
اب ہے شاخِ شجرِ غم پہ بسیرا میرا

تو جو چاہے تو مری شام ہو نکہت بہ کنار
قُرب سے تیرے نکھر جائے سویرا میرا

یہ گوارا نہیں مضطرؔ کو کسی طور کہ وہ
تیرے ہوتے ہوئے محتاج ہو تیرا میرا

سہیل غازی پوری

☆

جب اتر آتا ہے مہتاب فلک آنکھوں میں
زہر لگتی ہے ستاروں کی چمک آنکھوں میں

زخم بینائی بھرے بھی تو بھرے پھر کیسے
جب مرے لوگ چھڑکتے ہوں نمک آنکھوں میں

غم کے سیلاب کو تھمتے ہوئے دیکھا جب بھی
اشک خود آ گئے بن بن کے کمک آنکھوں میں

دل کے اندر کوئی دیوار گری ہے شاید
آج پھر ابھری ہے پہلی سی دھمک آنکھوں میں

اس نے دیکھا کہ نہ دیکھا مری جانب ہنس کر
بڑھتا رہتا ہے یہی سوچ کے شک آنکھوں میں

چوم لوں دل کی بصیرت سے کہ پھر برسوں تک
رقص کرتی رہے پھولوں کی مہک آنکھوں میں

دیکھنے کے لئے آنکھیں بھی ضروری ہیں سہیل
یوں تو سو رنگ دکھاتی ہے دھنک آنکھوں میں

سید رفیق عزیزی

☆

للہ الحمد کہ تو پاس تو ہے
کچھ نگہداریٔ انفاس تو ہے

دوستوں سے یہ عدو بہتر ہیں
ان میں کچھ آپ کی بوباس تو ہے

مفتخر فقر کی دولت پر ہوں
غیرتِ عشق کی عکاس تو ہے

تیری آمد کی توقع نہ سہی
موت آ جائے گی یہ آس تو ہے

کیوں مجھے تاک رہے ہیں رہزن
ہاں ' مگر دولتِ افلاس تو ہے

بات کیوں دل سے زباں تک آئی
یہ تنک ظرفیِ احساس تو ہے

محفل عشق ابھی سرد نہیں
گرمیِ زمزمہء یاس تو ہے

اس نے ہر گھونٹ پہ حالت پوچھی
میں نے ہر بار کہا پیاس تو ہے

محتسب ! جام پہ قدغن ہی سہی
سنت حضرت عباس تو ہے

کوئی باقی نہیں اب اس کا رفیقؔ
دوستوں کو یہی خناس تو ہے

مختار اجمیری

☆

جو سوتے جاگتے خواب و خیال پوچھیں گے
وہی تو گزرے ہوئے ماہ و سال پوچھیں گے

ابھی سے ذہن میں رکھیے' جواب کیا ہوگا
جو اگلے عہد کے بچے سوال پوچھیں گے

بڑھا رہے ہو جنہیں اگلے دَور کی جانب
وہ تم سے حال میں ماضی کا حال پوچھیں گے

اِسے سنبھال کے رکھیے زمیں ہے بازیچہ
اُجڑ گئی تو سبھی نونہال پوچھیں گے

قدم قدم پہ زمانے سے صاحبانِ کمال
عروج پوچھیں گے اس کا زوال پوچھیں گے

جو تیرگی میں سحر بھی گزر گئی تو سنو
شعاعِ مہر کا ذرّے مآل پوچھیں گے

بساطِ زیست پہ ہم شرحِ زندگی کے لیے
کسی کا خواب کسی کا خیال پوچھیں گے

رموزِ ہجر سے فرصت جو ہم کو مل جائے
تو حُسن و عشق سے رازِ وصال پوچھیں گے

غزل کو سُن کے یقیں ہے کہ ماہرانِ سخن
رُخِ کلام کا ہر خدوخال پوچھیں گے

ملیں جو راہ میں مختارؔ اہل فکر و نظر
تو اُن سے مسلکِ کشف و کمال پوچھیں گے

کرامت بخاری

☆

غزل کو ناقد و ناصح کہاں سمجھتے ہیں
یہ اہل دل ہیں جو دل کی زباں سمجھتے ہیں

جو ایک جام کی لذت سے بھی نہیں واقف
وہ اپنے آپ کو پیر مغاں سمجھتے ہیں

قلم کو قط بھی لگانا جنھیں نہیں آتا
وہ خود کو کاتب عصر رواں سمجھتے ہیں

عجیب بات ہے عقل و خرد کے ہوتے ہوئے
نہ ان کی میں نہ وہ میری زباں سمجھتے ہیں

کسی کے وعدہ فردا کا اور چاہت کا
یقین ہو بھی تو اس کو گماں سمجھتے ہیں

کبھی جو لکھنے پہ آئیں ہم ایسے اہل جنوں
زمیں کے فرش کو لوح جہاں سمجھتے ہیں

کچھ اور اس کی حقیقت نہیں ہے اس کے سوا
ہم اپنے گھر کو سفر کا نشاں سمجھتے ہیں

☆

راہِ وفا میں تیرے طلبگار ہم بھی تھے
ہاں جرم عاشقی کے سزاوار ہم بھی تھے

اس دھوپ کے سفر میں اکیلا نہیں تھا وہ
محروم لطف سایہ ء دیوار ہم بھی تھے

بازار کونسا تھا۔ جہاں آ گئے تھے ہم
وہ جنس کیا تھی جس کے خریدار ہم بھی تھے

جس آئینے میں اترا ترا خواب عکس
اس آئینے میں صورت تکرار ہم بھی تھے

جس داستاں کا مرکزی نقطہ تھی کائنات
اس داستاں کا ثانوی کردار ہم بھی تھے

یہ اور بات وقت نے ویران کر دیا
دل کے قدیم شہر کا بازار ہم بھی تھے

ارشد محمود ناشاد

☆

مکانِ دل کی بنیادیں ہلی ہیں
تمنائیں سراسیمہ کھڑی ہیں

دیئے کی لو مسلسل بڑھ رہی ہے
ہوائیں لڑتے لڑتے تھک گئی ہیں

ابھی شوقِ سفر باقی ہے ہم میں
مگر پاؤں میں زنجیریں پڑی ہیں

زباں پر تذکرے ہیں روشنی کے
دلوں میں ظلمتیں بڑھنے لگی ہیں

پُرانی پگڑیاں پیروں تلے ہیں
نئی نسلیں بغاوت کر رہی ہیں

شجر بے پیرہن ہونے لگے ہیں
بہاریں خونِ تازہ مانگتی ہیں

☆

شوق کی وارفتگی حد سے سوا ہونے لگی
زندگی اپنی دکھوں کا سلسلہ ہونے لگی

اس قدر احساس پر میرے وہ غالب آ گیا
اُس کی ہستی میری ہستی کا پتا ہونے لگی

آنکھ کی واماندگی نے پیرہن بدلے کئی
بے خیالی موسموں کا آئنہ ہونے لگی

میرا سر کٹ کر مرے قدموں کے اوپر ہی گرا
میری ناکامی مری فتحِ انا ہونے لگی

میں در و دیوار کے زنداں سے باہر آ گیا
ریگِ صحرا کی کشش زنجیر پا ہونے لگی

منظور ہاشمی (علی گڑھ۔انڈیا)

☆

بدن کو زخم کریں ' خاک کو لبادہ کریں
جنوں کی بھولی ہوئی رسم کا ' اعادہ کریں!

تمام اگلے زمانوں کو یہ اجازت ہے
ہمارے عہدِ گزشتہ سے استفادہ کریں!!

انہیں اگر مری وحشت کو آزمانا ہے
زمیں کو سخت کریں' دشت کو کشادہ کریں!!

چلو لہو بھی ' چراغوں کی نذر کر دینگے
یہ شرط ہو گی' کہ پھر روشنی زیادہ کریں!

سنا ہے' سچی ہو نیت' تو راہ کھلتی ہے
اگر سفر نہ کریں' کم سے کم ارادہ کریں!!

قدم قدم پہ کھلانے ہیں سرخ پھول' اگر
تو خار زار جنوں طے بھی' پا پیادہ کریں!!

صفدر حسین جعفری

☆

مجھ کو آواز جو آئی دل برباد کی تھی
میرے کھوئے ہوئے روٹھے ہوئے ہمزاد کی تھی

مڑ کے دیکھا تو مرے ساتھ کوئی شخص نہ تھا
اور ہواؤں میں صدا قریہء بیداد کی تھی

عمر تو تیرا تحیّر تھا مری آنکھوں میں
خون میں میرے یہ شورش دل ناشاد کی تھی

تو نے پہچان لیا ہے تو بتا کون ہوں میں
میری مٹی میں یہ خوشبو مرے اجداد کی تھی

تو نے بھی توڑنا چاہا مرا صد پارہ بدن
مجھ پہ یکجائی کی تہمت دل برباد کی تھی

مرگِ انبوہ پہ ہنستا تھا نہ روتا تھا کوئی
گونج سی گنبد افلاک میں فریاد کی تھی

انور شعورؔ

☆

میں ہاتھوں میں ہیرے ستارے لئے ہوں
تمہارے لیے تھا، تمہارے لیے ہوں

حسابِ شب و روز ہیں یہ کوائف
فسانے نہیں، گوشوارے لیے ہوں

ضروری ہیں جو زندگی کے سفر میں
میں شانوں پہ وہ بوجھ سارے لیے ہوں

مجھے بازوؤں پر بھروسا ہے اپنے
گروں گا نہیں، دو سہارے لیے ہوں

شعورؔ ایک آوارگی کی بدولت
نگاہوں میں کیا کیا نظارے لیے ہوں

☆

گویا گزر رہے ہیں دن رات مستیوں میں
رنگوں میں رونقوں میں باغوں میں بستیوں میں

میں کون آدمی تھا کیا خواب دیکھتا تھا
بھولے ہوئے ہوں سب کچھ بادہ پرستیوں میں

دیکھے کوئی ہمارے دل کا محل کہ ہم نے
جنت بنا رکھی ہے دنیا کی پستیوں میں

زیرِ فلک ہماری عمرِ عزیز گزری
کچھ حق پرستیوں میں کچھ بت پرستیوں میں

پی کر اگر دکھا دے اور ایک دو تماشے
انور شعورؔ ہو گا مشہور ہستیوں میں

حسن عسکری کاظمی

☆

خاک میں مجھ کو ملا کر رکھا
زندگی تو نے مٹا کر رکھا

جانے کیا بھید ہے رسوائی کا
میرے پہلو میں بٹھا کر رکھا

آہ کھینچی ہے نہ آنسو نکلے
درد پہلو میں چھپا کر رکھا

میرے احباب نے بخشا نہ مجھے
کوئی پتھر نہ بچا کر رکھا

شورِ ماتم سے زمیں کو میں نے
شبِ فرقت میں ہلا کر رکھا

گردشِ وقت نے دنیا میں مجھے
نقشِ عبرت ہی بنا کر رکھا

کیا قیامت ہے کہ میرے سر کو
طشت میں اس نے سجا کر رکھا

صدیق شاہد

☆

جو نذر ہجر مرا ایک ایک سال ہوا
مرے غموں کا مداوا ترا وصال ہوا

زمیں سے اٹھ نہ سکا میں کہ خاک زادہ تھا
میں رہروں کے قدم سے بھی پائمال ہوا

اسے تھا زعم، وہ جیسے مری ضرورت ہے
گئے پہ اس کے نہ جینا مجھے محال ہوا

گلوئے حق پہ زبردستیوں کا خنجر ہے
امیدِ داد رسی خام اک خیال ہوا

بچھڑ کے رہ گئے ہم زیست کے بہاؤ میں
وہ ہم نشینی کا رشتہ نہ پھر بحال ہوا

کچھ ایسی شکل بنا لی جراحتِ دل نے
وُرود اس کا نہ پھر وجہ اندمال ہوا

چنی بھی میں نے تو دنیا سے روشنی ہی چنی
میں زیر بار ترا، اے حسنِ جمال ہوا

صابر عظیم آبادی

☆

کسی بھی بات کا لوگوں میں انکشاف نہ ہو
میں ڈر رہا ہوں کہ دنیا مرے خلاف نہ ہو

فسانہ گھڑنے سے حاصل نہیں ہے کچھ بھی وہاں
جہاں تمہاری حقیقت کا اعتراف نہ ہو

اسی کی قدر کرو تم اسی کو اپناؤ
زمانے والوں کو جس شے سے انحراف نہ ہو

کسی سے گفتگو کرنے میں یہ خیال رہے
تمہاری بات سے دل میں کوئی شگاف نہ ہو

انا کی گرد کو دھولو تو آکے مجھ سے ملو
کہ ایسا ہو نہ کہیں میرا دل بھی صاف نہ ہو

الٰہی بخش دے بندوں کی سب خطاؤں کو
قصور ایسا نہیں کوئی جو معاف نہ ہو

یہی طریقہ ہے احسن سماج میں صابر
کریں جو بات تو آپس میں اختلاف نہ ہو

سلیم زاہد صدیقی

☆

آج بستی کے ہر اک گھر کا ہے ہر در خاموش
جیسے طوفان سے پہلے ہو سمندر خاموش

عشق کچھ کھیل نہیں ۔ شمع کو پروانے اگر
چھو نہیں پاتے تو مر جاتے ہیں جل کر خاموش

کیا کوئی سانحہ گزرا ہے سرِ وادیء مے
گنگ ہے پیر مغاں اور ہیں ساغر خاموش

میں بھی ظالم کے ہی زمرے میں ہوا ہوں داخل
ان کی بیداد پہ ہو جاتا ہوں ہنس کر خاموش

ضبط کرنے کی بھی حد ہوتی ہے' انسان ہوں میں
ٹھوکریں کھائیں تو رہتے نہیں پتھر خاموش

دیکھتے رہتے ہیں' اربابِ کرم کو دن رات
ہم بھی غالبؔ کی طرح' بھیس بدل کر خاموش

کون سا غم ہے جسے ٹال رہے ہیں زاہد
آج کل آپ نظر آتے ہیں اکثر خاموش

محمد اویس جعفری (سیاٹل۔امریکہ)

☆

یوں جیتا ہوں تنہا، کوئی اپنا نہ ہو جیسے
گلشن میں ہوں پر سبزۂ بیگانہ ہو جیسے

اک ہُوک سی اٹھتی ہے کسی یاد سے اکثر
دل ہے کہ چھلک جاتا ہے پیمانہ ہو جیسے

سَر دھنتے ہوئے پھرتے ہیں یوں صحنِ چمن میں
پتّوں کی زباں پر مرا افسانہ ہو جیسے

ہے مست صبا کا کل شگوں کی مہک سے
پھولوں میں بھی عکسِ رخِ جانانہ ہو جیسے

پھر آئی تصور میں وہ اک چشمِ غزالیں
قبضہ میں میرے دولتِ میخانہ ہو جیسے

اک ساعتِ گم گشتہ میں گم گشتگیِ دل
گلیوں میں شہر کی کوئی دیوانہ ہو جیسے

اشعار ترے شاعرِ ناکامِ تمنا
افسانہ در افسانہ در افسانہ ہو جیسے

ڈاکٹر مظہر حامد

☆

کچھ ایسے حوادث مری تقدیر میں آئے
تقریر میں آئے جو نہ تحریر میں آئے

چلتے ہیں تو زنداں کے لرزتے ہیں در و بام
ہم اہلِ جنوں حلقۂ زنجیر میں آئے

ہر خواب کہ آنکھوں میں سلگنے کے لئے ہے
چنتا ہوں وہی خواب جو تعبیر میں آئے

مت پوچھ ستم کتنے دلِ زار پہ ٹوٹے
ماتھے کی شکن کیوں مری تصویر میں آئے

جو قفل تھا ہونٹوں پہ سو وہ اب بھی لگا ہے
اب دل کی صدا پاؤں کی زنجیر میں آئے

رو رو کے گلے ملتے ہیں یوں حرفِ محبت
ہر لفظ کو ہے رشک کہ تحریر میں آئے

مظہر جسے کہتے ہیں ملاقات کا امکاں
وہ حادثہ شاید میری تقدیر میں آئے

حسیر نوری

☆

اپنی تنہائی کے زنداں سے نکلتے کیسے
ہم پگھل ہی نہ سکے سانچے میں ڈھلتے کیسے

زندگی بھر کے لئے جو بھی ہوئے ہیں معذور
عذر کا کوئی سبب ہی نہ تھا چلتے کیسے

پھول کو دھول میں دیکھا تو بھر آئیں آنکھیں
خود تھے روندے ہوئے پھولوں کو مسلتے کیسے

ہم کو پرکھا گیا تیز آنچ پہ اکثر رکھ کر
ہم بڑے ظرف کے انساں تھے پگھلتے کیسے

میرا کیا میں تو حوادث میں ہوں پلنے والا
نازک اندام تھے وہ دھوپ میں چلتے کیسے

جن سے ہو جاتی تھی چہروں کی صداقت روشن
وہ دیئے انجمنِ کذب میں جلتے کیسے

اہلِ گلشن کی خطاؤں کا صلہ ہے یہ حسیر
تلخیوں سے یہ شجر پھولتے پھلتے کیسے

محمود رحیم

☆

گلاب آئے نہ خواب آئے
ہمیں رتوں کے عذاب آئے

سحاب ہے تو شراب آئے
کہ شیخ عالی جناب آئے

وہ کنجِ گل میں ہے ساتھ میرے
غزل کی کوئی کتاب آئے

گواہیاں ہوں گی دوستوں کی
ہمیں جو فرد حساب آئے

گلی تو سونی ہے میر صاحب
پھر ایک خانہ خراب آئے

زمین زادوں کی صف میں تھے ہم
سو ہر طرف سے عتاب آئے

نورالزماں احمد اوج

☆

لوحِ جہاں پہ مطلعِ تاباں ہمیں تو ہیں
آئینہ دارِ عظمت انساں ہمیں تو ہیں

ہم نے کیا ہے عہدِ محبت کو استوار
راہ وفا میں شمع فروزاں ہمیں تو ہیں

ہے اپنے دم قدم سے تب وتابِ زندگی
تاریکیوں میں مہر درخشاں ہمیں تو ہیں

دیتے ہیں کاروانِ محبت کو حوصلہ
صحرائے زندگی میں ہدی خواں ہمیں تو ہیں

کرتے ہیں اہل دہر کو ہم روشنی عطا
وجہ نمودِ دانش و عرفاں ہمیں تو ہیں

نغمہ بلب ہمیں ہیں الم کی فضاؤں میں
عہد خزاں میں رنگ بہاراں ہمیں تو ہیں

کرتے ہیں ہم طلوع شب غم میں آفتاب
گویا حریف گردشِ دوراں ہمیں تو ہیں

جذبات میں خروش ہمارے ہی دم سے ہے
بحر تصورات میں طوفاں ہمیں تو ہیں

آباد ہم سے ہے یہ جہانِ خراب بھی
مسند نشیں حلقہ ء زنداں ہمیں تو ہیں

دیوانگی کو ہم نے عطا کی ہیں رفعتیں
ہر انجمن میں چاک گریباں ہمیں تو ہیں

ہر شاخ آرزو پہ ہیں قاصد بہار کے
پیغمبر بہار گلستان ہمیں تو ہیں

جلوے تمام حسن نظر کے ہیں ہر طرف
روح و روان بزم نگاراں ہمیں تو ہیں

افزائش جنوں کا ہمیں پر ہے انحصار
ہوش وخرد سے دست وگریباں ہمیں تو ہیں

ہم ہیں تو ہے ظہور جلال و جمال بھی
رونق فزائے محفلِ امکاں ہمیں تو ہیں

جرم و سزا کا ہم سے ہی بازار گرم ہے
آرائشِ سلاسل و زنداں ہمیں تو ہیں

رعنائی خیال ہمارے ہی دم سے ہے
دشتِ غزل میں اوجؔ غزل خواں ہمیں تو ہیں

خالد یوسف

☆

مشکلوں کو قافلے کا پاسباں رہنے دیا
جذبۂ منزل کو میرِ کارواں رہنے دیا

لالہ رخ، نسریں بدن سب کی جوانی ڈھل گئی
ہم نے اپنی حسرتوں کو نوجواں رہنے دیا

چوک ہم سے بھی ہوئی ورنہ شفا مشکل نہ تھی
اُن کو اپنے حالِ دل پر مہرباں رہنے دیا

زہرہ و پرویں سے آگے لے گئے تخئیل کو
لیکن اپنے دل کو ان کا نغمہ خواں رہنے دیا

ہم نے اس سیماب تن کی آنکھ نم ہونے نہ دی
اور خود اپنے جگر کو خونچکاں رہنے دیا

ہم نے ہر محفل سے کچھ کچھ نور اڑایا ہے مگر
تم کو اپنی بزم کی روح رواں رہنے دیا

تہلکہ سا ہم مچا سکتے تھے ہر اک بزم میں
وقت نے دو دن ہمیں یکجا کہاں رہنے دیا

سبزہ و برگ وگل و بلبل پہ آنچ آنے نہ دی
بجلیوں کی زد میں اپنا آشیاں رہنے دیا

سہیل اختر

☆

گریباں چاک لوگوں کے بڑے لشکر نکلتے ہیں
ترے رخ کے پس منظر عجب منظر نکلتے ہیں

یہ کیسا آئینہ خانہ ہے تیری بزم رنگیں بھی
کہ اہل عقل بھی اس بزم سے ششدر نکلتے ہیں

ترے صہبا کدے کی عظمتیں ہوں کیا بیاں ہم سے
گدا بھی ہوں تو وہ بھی بن کے اسکندر نکلتے ہیں

ترے رخسار ولب کا خواب تو صدیوں پہ بھاری ہے
بڑی مشکل سے ہم اس خواب سے باہر نکلتے ہیں

مقید ہو چکے ہیں گنبدِ بے در میں ہم لیکن
جو ٹکرانے کی ہمت ہو تو کتنے در نکلتے ہیں

تعصب نے رگوں میں اس طرح سے زہر کاری کی
کہ اب تو آستیوں سے فقط خنجر نکلتے ہیں

فصیلِ شہر سے باہر کا یارو کیا کریں شکوہ
کہ سو فتنے ہیں جو اس شہر کے اندر نکلتے ہیں

وفا کی راہ میں کٹنے کی ہو جن میں تڑپ اختر
ہزاروں میں فقط دو چار ایسے سر نکلتے ہیں

نوید سروش

☆

پھول جیسی بستی میں کیسے لوگ بستے ہیں
نفرتیں اُگلتے ہیں سانپ بن کے ڈستے ہیں

قہقہوں میں جو اکثر خود کو بھول جاتے ہیں
پھر وہ مسکرانے کو عمر بھر ترستے ہیں

لوگ خود فریبی میں ہو کے مبتلا اکثر
اپنے عیب ڈھکنے کو دوسروں پہ ہنستے ہیں

پیار کرنے والے تو مستحق ہیں پھولوں کے
اُن پہ پھر ملامت کے سنگ کیوں برستے ہیں

کہہ دیا سروش اس نے مجھ کو بھول جاؤ تم
زندگی بتانے کے اور بھی تو رستے ہیں

پروفیسر زہیر کنجاہی

☆

جس طرف لے کر جنون بزم آرائی گیا
ہر قدم پر ساتھ اک احساس تنہائی گیا

اجنبی چہرے نظر آئے جدھر اٹھی نگاہ
محفل دنیا سے یوں رنگ شناسائی گیا

تیری دھن ، تیری تمنا ، تیرا غم ، تیرا خیال
یہ ملے جس دم مجھے ہر کرب تنہائی گیا

کہکشاں کے پھول ہیں چاروں طرف بکھرے ہوئے
اب دیار گل سے لطف آبلہ پائی گیا

ہرقدم پر آستاں آواز دیتے ہیں زہیر
سر جھکے کیسے کہ اب ذوق جبیں سائی گیا

سید صفدر حسین جعفری

کشمیر

(جدوجہدِ آزادی کے تناظر میں)

تدبیر بھی ناکام تھی، شمشیر بھی ناکام
اقبال نے پھر ذوقِ یقیں کا دیا پیغام
قائد نے پھر اس راہ پہ کی راہ نمائی
دی نعرۂ تکبیر پہ دشمن نے دہائی
یہ پاک وطن ہجرتِ ثانی کا گھر ہے
اسلاف کی اک جہدِ مسلسل کا ثمر ہے

☆

چاند اور ستارے سے مزین ہے یہ پرچم
ہجرت کے مقاصد سے مدون ہے یہ پرچم
لازم ہے کہ ہم چاند گہن سامنے رکھیں
اس جشن میں بھی رنج و محن سامنے رکھیں
دو لخت ہوا پاک وطن سامنے رکھیں

☆

اکھنور پہ پینتیس برس قبل وہ یلغار
کفار کی پھنکار پہ اسلام کی للکار
سازش کا وہ ماحول وہ فقدانِ تدبر
یوں ڈوب گیا مے کے سمندر میں تہور

جیتے تھے جو میدان میں ہم میز پہ ہارے
اور طرفہ ستم وقت نے پتھر ہمیں مارے

☆

ہے ملتِ اسلام کا آدرش اخوت
لازم ہے بہم عدل کے کثرت میں ہو وحدت
اعلیٰ ہے کوئی نسل نہ فائق ہے کوئی رنگ
پھر ضربتِ حیدر سے لرزتی ہے رگِ سنگ
عنقا ہو اگر عدل بھٹک جاتی ہیں قومیں
ذلت کی صلیبوں پہ لٹک جاتی ہیں قومیں

☆

صاحبِ نظراں! ٹوٹ گیا دُرِ یقیں بھی
باقی نہ رہے ضبط و عمل زیرِ نگیں بھی
وعدہ تھا کہ ہم ساتھ جئیں ساتھ مریں گے
ہم مشرق و مغرب کی سیاست نہ کریں گے
وعدے سے جو اک لحظہ مکر جاتی ہیں قومیں
پھر بہرِ مکافات بکھر جاتی ہیں قومیں

☆

اندر سے تو مدت ہوئی ہم ٹوٹ چکے تھے
ظاہر میں بھی اک دوجے سے ہم چھوٹ چکے تھے
ہم بھول گئے تھے کہ خطرناک ہے دشمن
امکان تصور سے بھی چالاک ہے دشمن

☆

عشاق سرِ دار کھڑے دیکھ رہے تھے
ہم بے بس و لاچار کھڑے دیکھ رہے تھے
غیروں کا ہر ایک وار کھڑے دیکھ رہے تھے
ہم روئے ستمگار کھڑے دیکھ رہے تھے
ہوتے ہوئے دولخت وطن دیکھ رہے تھے
قائد کا اجڑتا ہے چمن دیکھ رہے تھے
وہ لمحہء غم آنکھ کی پتلی پہ رقم ہے
رونے کے لیے عرصہء محشر ہمیں کم ہے

☆

پینتیس برس قبل جو کھویا نہیں پایا
اس سمت سے بھی کوئی تقاضا نہیں آیا
ہاں اب بھی ہے بنگال مری روح، مری جاں
سازش وطنیت کی ہوئی سر بگریباں
مغرب ہو کہ مشرق ہو بدلتی نہیں ملت
ایک اس کا خدا ایک رسولؐ ایک حقیقت

☆

صفدر ہوسِ زر بھی ہے اک فتنہء کہنہ
دنیا سے لگاتے نہیں دل اہلِ تمنا
زنجیر یہ توڑیں گے تو دشمن سے لڑیں گے
دہلیز یہ چھوڑیں گے تو دشمن سے لڑیں گے
دنیا کو کبھی دل میں بسایا نہیں کرتے
یوں دامنِ تزویر میں آیا نہیں کرتے

☆

کشمیر سے آتی ہے صدا رنج و محن کی
پھیلی ہوئی خوشبو ہے شہیدوں کے کفن کی
کشمیر کے پاؤں میں ہے زنجیر ابھی تک
ماتھے پہ غلامی کی ہے تحریر ابھی تک
یہ خواب عقوبت سے جگانے کی گھڑی ہے
سونے کی نہیں ہوش میں آنے کی گھڑی ہے
ہیبت دلِ دشمن پہ بٹھانے کی گھڑی ہے
یہ نعرۂ تکبیر لگانے کی گھڑی ہے
ابنائے وطن جان لڑانے کی گھڑی ہے
کشمیر کو آزاد کرانے کی گھڑی ہے
اے اہلِ وطن! لمحہء موجود نہ کھو جائے
دیکھو کہ کہیں ساعتِ موعود نہ کھو جائے

عبدالعزیز خالد

رباعیات

(۱)

اب کس سے کریں شکوۂ تقسیم معاش؟
کھاتے "ملاءِ الاعلیٰ" کچھ رحم اے کاش!
تہ مُجرد ہو مفلسوں کو آپ حیواں
ٹوٹے داتوں میں کریں روزینہ تلاش!

(۲)

دلشاد گزاریں جو حیاتِ گزراں
کیا جانیں وہ تیرہ روزیِ دل زدگاں!
بلکہ کہیں الٹا: کسے تقدیر میں دخل؟
ہے شرک مداخلت بہ کارِ یزداں!

(۳)

بیکار ہے قیل و قال کج بحثوں سے
اپنی ہی بات پر رہیں گے وہ اڑے
اوّل تو مقابل کا نہ سمجھیں موقف
سمجھیں بھی تو آڑے ان کی "میں" آ جائے!

(۴)

گو تاخت و تاراج کرے جی بھر کر
پانی نہ کبھی پروں پہ پڑنے دے مگر
بے چون و چرا کرے جو تقصیر قبول
ایسا کوئی حق پرست آتا ہے نظر؟

(۵)

اب بھی جو سمجھتے ہیں زمیں کو ساکن
کر سکتے نہیں فرقِ محال و ممکن
بھرمار ہے ایسے "اہلِ ارشاد" کی جو
فی العلم یقولون بغیرِ علمٍ!

(۶)

محدود ہے مہلتِ حیاتِ بشری
اب اس کو خرابی کہو چاہے خوبی
قسام نے بخشے ہمیں معدود انفاس
لے دے کے ہماری جمع پونجی ہے یہی!

(۷)

جاتا نہیں سیر ہو کے بھی ترسیواں
ہر کوئی پئے مزید پیہم کوشاں
آئے نہ کبھی مرحلۂ ترکِ طلب
نکلیں نہ کبھی بقدرِ حسرت ارماں!

(۸)

جو کچھ بھی تہ چرخِ کہن تجھ کو ملا
قدرت کا عطیہ ہے نہیں کسب ترا
جتنی بھی ہو شکر گزاری کم ہے
ازبسکہ رہے سلب کا ہر دم خطرہ!

ڈاکٹر خیال امروہوی

قطعات

جمال قد نہ خدوخال امتزاجی ہیں
خبیث فکر کے سب زاویئے نراجی ہیں
میں ایسے حشر کو کہتا ہوں عصر بے چہرہ
مری لغت کے اشارات احتیاجی ہیں

یاد ماضی کے خنک سائے میں رہنا چاہیئے
سرمدی احساس کی لہروں پہ بہنا چاہیئے
جس وطن کی چاندنی راتیں ہمیں تسکین دیں
اس وطن کے چاند کو بھی چاند کہنا چاہیئے

ہم سے کیا راز چھپاتے ہیں چھپانے والے
راز کی تہہ میں چلے جاتے ہیں جانے والے
اپنی کٹیا کو تو آندھی میں سنبھالیں پہلے
پوری امت کو تباہی سے بچانے والے

اختلاف رنگ و بو وحدت کی دشمن کیوں بنے
عقل بے بنیاد ارمانوں کی سوکن کیوں بنے
وہ چمن جس پر کھرے جذبوں نے چھڑکا ہو لہو
اب وہی بذات اوباشوں کا مسکن کیوں بنے

لہو کے گھونٹ پینے ہم سے بے اوقات باقی ہیں
غم حالات سہنے مضمحل طبقات باقی ہیں
تمہیں ٹھنڈک پلانے لوگ ملتے ہیں کرائے پر
کڑے سورج میں جلنے کیلئے دیہات باقی ہیں

بھول جاتا ہے زمانہ سابقہ اوقات کو
زعم باطل ہے کہ سب چرخ کہن کی دین ہے
سیم و زر کا ڈھیر ہو یا سبز باغوں کی قطار
جو بھی جس کے پاس ہے وہ اس وطن کی دین ہے

سنگ و آہن کو تراشو غم فردا نہ کرو
ملتجی آنکھ سے اغیار کو تاکا نہ کرو
اپنی ہستی کو بچانا ہے تو نادانوں سے
سانس لینے کے طریقے کبھی پوچھا نہ کرو

ہماری آگ سے روشن ہیں رفعتوں کے چراغ
ہمیں نہ ہوں تو اجالے کا بھی نشاں نہ ملے
جدید فکر میں وحدت کا کیا اثر ملتا
یہاں تو دین پہ بھی لوگ ہمزباں نہ ملے

صابر عظیم آبادی

رُباعیات

راحت کی ہوا پھر سے ہے چلنے والی
بے چین طبیعت ہے بہلنے والی
گھبرانہ اندھیروں کے گھنے جنگل سے
یہ رات اُجالے میں ہے ڈھلنے والی

☆

سچائی کا ماحول بنانا ہو گا
احساس کے دریا میں نہانا ہوگا
اُلفت کے دیے کر کے جہاں میں روشن
نفرت کے چراغوں کو بجھانا ہوگا

☆

مایوس کیا تیری نوازش نے مجھے
رُسوا کیا ہر گام نمائش نے مجھے
منزل کی تمنا میں پھرا آوارہ
رکھا نہ کہیں کا مری خواہش نے مجھے

☆

دیوار تکبر کی اُٹھایا نہ کرو
تم کیا ہو کسی کو بھی بتایا نہ کرو
محنت سے کرو اپنا ستارہ روشن
تقدیر پہ الزام لگایا نہ کرو

خالد یوسف

قطعات

کسی کی یاد کو سونے نہیں دیا ہم نے
ہزار غم کے سہی ، گیت تو سنائے ہیں
تمام عمر کسی بیوفا کے کوچے میں
چنے ہیں خار تو کیا پھول بھی کھلائے ہیں

☆

اگر چہ آج بھی زخموں سے چور چور ہے دل
اگر چہ اب بھی وہی ابرِ غم کا سایا ہے
مگر وہ چین نہ ہو گا انہیں نصیب کبھی
جو میں نے ان کی محبت میں کھو کے پایا ہے

☆

بہت عزیز ہیں مجھ کو یہ غم کے سائے بھی
کہ ان غموں پہ کسی مہ جبیں کا سایا ہے
ان آنسوؤں کی اڑاتے ہو کیوں ہنسی یارو
ان آنسوؤں نے تو ہنسنا انہیں سکھایا ہے

☆

کچھ ساغر و مینا سے نہیں مے سے غرض ہے
ٹوٹے ہوئے ساغر سے بھی ہم پیتے رہیں گے
ہے سانس بھی باقی تو کفن فصلِ خزاں کا
جکڑے ہوئے ہاتھوں سے بھی ہم سیتے رہیں گے

سیّد منصور عاقل

نقد و نظر

کتاب : دل کی باتیں

مصنفہ : ثاقبہ رحیم الدین

ناشر : مصنفہ ۔ ۹ جامی روڈ ۔ راولپنڈی کینٹ

قیمت : چار سو روپے

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی تصنیف یا تالیف پر تبصرہ و تجزیہ کا عمل مصنف و مولف کی کثیر الجہت شخصیت کے سبب پس منظر میں چلا جاتا ہے اور وہ توجہ جو کتاب کے مندرجات پر مرکوز ہنی چاہیے وہ لکھنے والے کے معروف و معلوم اوصاف کی طرف منتقل ہو جاتی ہے چنانچہ یہی دشواری زیر نظر کتاب کا انتقادی جائزہ لیتے وقت پیش آرہی ہے کہ مصنفہ کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے متعدد ایسے حوالے ہیں جن سے صرف نظر کرنا یا انہیں موخر کرنا اس لئے ممکن نہیں کہ کتاب کا سرنامہ ہی یعنی ''دل کی باتیں'' مصنفہ کی داخلی شخصیت کی طرف واضح رہنمائی کرتا ہے' اس اعتبار سے کتاب کی منفرد حیثیت متقاضی ہے کہ مصنفہ کی شخصیت کے اُن پہلوؤں کا جائزہ بتقدیم لیا جائے جو کتاب کے عنوان اور موضوع دونوں کو توجیہہ فراہم کرتے ہیں۔

ثاقبہ رحیم الدین کا تعارف کرانا اس لیے بے جواز ہوگا کہ نہ تو زیر تبصرہ تصنیف ان کی اولین قلمی کاوش ہے اور نہ علم و ادب سے اُن کی وابستگی غیر معروف' دو درجن سے متجاوز کتب ان کا درشۂ تحریر ہیں جو موضوعات کے اعتبار سے متنوع بھی ہیں اور ان کے مخصوص زاویہ ہائے نظر کی آئینہ دار بھی۔ ان تصانیف میں 'محفل تنہائی' (ادبی تحریریں) 'تہذیب کے زخم' (مضامین اور

افسانے) 'درِ ہی درد' ، 'محبت' اور 'گلہائے رنگ رنگ' جیسی تخلیقات جن میں انشائیے بھی شامل ہیں سرِ فہرست ہیں یہ سب اہلِ علم وخبر میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں ان کے علاوہ بیگم صاحبہ کے نمایاں ترین رجحان اور اُن کی فکری ترجیحات کی متعدد دیگر کتب جو غماز ہیں وہ تمام تر بچوں کے ادب سے متعلق ہیں اور یہی ان کی شخصیت کا دلنواز پہلو بھی ہے۔ تعلیم وتہذیب اور نونہالوں میں کردار کی تشکیل وتعمیر کا جو غالب رجحان بیگم صاحبہ کا اثاثہء فکر وفن بن گیا ہے وہ ان کے جلیل القدر خانوادے کے بزرگوں کا فیضان ہے۔ والد ڈاکٹر محمود حسین مرحوم معروف مورخ ومصنف' کراچی اور ڈھاکہ کی جامعات کے وائس چانسلر اور پاکستان کے وزیر معارف' چچا ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم عظیم ماہر تعلیم اور بھارت کے صدر مملکت اور دوسرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین مرحوم جن کی تصانیف نے اردو ادب میں تحقیق وتنقید کے نئے در وا کئے اور جنہیں دیوانِ غالب کا انگریزی ترجمہ کرنے پر بھارت کے عظیم ترین ادبی اعزاز ''پدم بھوشن'' سے نوازا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ فیضانِ نسبی زیر تبصرہ تصنیف کی مصنفہ کا سرمایہء افتخار ہے۔

''دل کی باتیں'' کم وبیش پونے پانچ سو صفحات پر مشتمل تصنیف ہے جو مصنفہ کے معارفِ قلبی اور وجدان کی گوناں گوں کیفیات کا مرقع ہے جس کا اسلوب اس لئے منفرد ہے کہ کتاب کا مطالعہ قاری پر خود کلامی جیسی واردات منکشف کرتا ہے۔ روحانی طہارت اور تخیلی رفعت کا جذب وکیف سے مملو ایک ایسا ماحول پڑھنے والے کے حواس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جہاں عبد ومعبود کے درمیان تمام حجابات تحلیل ہو جاتے ہیں گویا کتاب کے منتشر ومتنوع موضوعاتِ فکر خالق ومخلوق کے درمیان ایک مکالمے کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں یہ موضوعات سائل ومسئول کے درمیان براہ راست ترسیل وابلاغ کا روحانی عمل ہیں جن سے سائل کے دل و دماغ کی وہ تمام کیفیات واضح ہو جاتی ہیں جن کی جڑیں اس دنیائے رنگ وبو میں پیوست ہیں۔ اس حقیقت کا ثبوت درج ذیل اقتباس سے فراہم ہوتا ہے جو مصنفہ کے خود تحریر کردہ کتاب کے

"ابتدائیہ" سے لیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"ہم اپنے آپ میں اور اپنی سوچوں میں گم ہیں کہ یہ دنیا کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ پر اب وقت نہیں رہ گیا ہے کہ ہم اسے جانیں اور سمجھیں۔ بس میرے اللہ بس! تم جانو اور تم سمجھو۔ یہ دنیا تمہاری' زمین و آسماں تمہارے اور یہاں کے سب لوگ تمہارے۔ ہم ٹھہرے ایک فقیر' ایک مسافر بس۔ نیم تلے رین بتا کر اپنی راہ لیں گے۔"

یہی اُسلوب تمام کتاب کا احاطہ کیے ہوئے ہے جس کا مطالعہ استغراق و محویت پیدا کرتا ہے کہ یہ وہ موضوعات ہیں جن کی تہہ تک بقول اقبال "من میں ڈوب کر" ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ کتاب مطالعہ کیلئے سکون اور تنہائی چاہتی ہے کیونکہ اس میں باطنی تجربات کا برملا' بے تکلف اور بے محابا اظہار موجود ہے جو عبد اور معبود کے والہانہ تعلق کو استوار کرتا ہے بس ایک مزید اقتباس پر اختتام کلام:

"ہماری فضاؤں اور ہماری ہواؤں میں ہوس اور حسد کا زہر گھلا ہے کہ سانس لینا دشوار ہے ایسا حبس ہے کہ لوگ لُو کی چاہت کرنے لگتے ہیں۔ ہماری آنکھوں میں خاک سی اڑتی رہتی ہے جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ یہ آنکھیں ہر دم' کچھ زمانے سے ہمارے سامنے انجانے راستے' بے نشان گلیاں' نیا آسمان' بیگانی زمین اور اجنبی ہوائیں ہیں' ہم جائیں تو کدھر جائیں اور کدھر جا رکیں۔ اب تک جیون کا سفر کچھ اور تھا اور اب جیون کے بعد کا سفر کچھ اور ہوگا۔ ہوگا کیوں۔۔۔۔ یہ تو شاید شروع ہے اور ہم پہلا قدم دھر چلے ہیں' دل کے بند دریچے کھلے اور تازہ ہوا آئی ہے' گھڑی دو گھڑی کی بات ہے سامنے نئی زندگی ہے اور ہمیشہ رہنے والی زندگی۔"

کتاب : کیفِ دوام

مصنف : محمد حسن زیدی

ناشر : منزل پبلیکیشنز۔ اسلام آباد

قیمت : دوسو پچیس روپے

حسن زیدی خوش نصیب ہیں کہ انکے فکرِ سخن کا پہلا نقشِ تخلیق نعتیہ مجموعے کی صورت میں اُفق ادب پر طلوع ہوا ہے یہ وجہ سعادت بھی ہے اور باعثِ تکریم بھی کہ نعت اب ایک دل آویز اور دل پذیر صنف سخن ہی نہیں بلکہ حُب رسولؐ سے سرشار اہل ارادت کے لئے جزوِ ایمان بھی ہے۔ خداشناسی کا وسیلہ ہی نہیں خدارسی کا ذریعہ بھی ہے بقول اقبالؒ:

بہ مصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

چنانچہ ''کیف دوام'' جو شاعر کی باطنی بلکہ روحانی کیفیات کا مرقع ہے ایک مخصوص جذباتی شیفتگی اور طہارت فکر کا غماز ہے۔ مجموعے کی یہ جہت اس قدر اظہر من الشمس ہے کہ شاعر بعض نشیب وفراز کے ایسے مراحل سے بھی عالمِ سرخوشی میں بے نیازانہ گزر گیا ہے جہاں ہوسکتا ہے کہ سطح بیں ناقدان فن ابلاغ واظہار کے اس انداز کو محل نظر قرار دیں لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں کہ شاعر کے اخلاصِ فکر سے صرف نظر کیا جا سکے حسن زیدی کا ایمان وایقان ملاحظہ ہو:

شرف ملا یہ مجھے انکی خاک پا ہوکر رہے زمانے میں اکسیر وکیمیا ہوکر

نبیؐ کو دیکھ کے ہم نے خدا کو پہچانا حق آشنا ہوئے آگاہِ مصطفےٰؐ ہوکر

اٹھا یہاں سے نہ اے گردشِ زمانہ مجھے درحبیب پہ آیا ہوں جا بجا ہوکر

''کیفِ دوام'' کے مصنّف کی اس ذہنی ساخت میں مکتب کی کرامت سے کہیں زیادہ نظر کا فیضان کارفرما دکھائی دیتا ہے کہ ان کی تربیت وپرورش کے نقوش ان کے کردار اور فکر ونظر میں

ڈھلتے چلے گئے چنانچہ زیرِ تبصرہ مجموعہ کو مصنف نے اپنے گرامی منزلت والدین سے معنون کیا ہے اور عنوانِ کلام خود انکے ایک نعتیہ شعر سے ماخوذ ہے۔ تقاریظ میں نعیم فاطمہ علوی کا درج ذیل مختصر مگر جامع تاثر خلاصہء کلام کی حیثیت رکھتا ہے۔

''حسن زیدی صاحب کی غزلیہ نعتیں تمام بیقراریوں ' بے چینیوں اور اضطرابوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور فنی محاسن سے بھی مزین نظر آتی ہیں''۔

''غزلیہ نعتیں'' کہہ کر تقریظ نگار نے شاعر کے محبوب و مرغوب اسلوبِ شعری کی طرف واضح اشارہ کیا ہے جس کا ثبوت کلام کا مطالعہ مہیا کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر مقامات پر تغزل آمیز اُسلوبِ نگارش نے کلام کو تازگی عطا کی ہے مثلاً

چہرہ دکھا کے خلق کو حیران کر گئے　　خوبانِ دو جہاں کو پشیمان کر گئے
اللہ رے تجلیء سرکارِ دو جہاں　　جان اپنی مہر و ماہ بھی قربان

غمِ رسولؐ میں زار و نزار بیٹھے ہیں　　قرار دل کو نہیں بیقرار بیٹھے ہیں
خوشا طریقہء عشاق راہِ طیبہ ہیں　　کبھی چلے کبھی شکلِ غبار بیٹھے ہیں

- اے صلِ علیٰ جب دل کی طرف وہ آنکھ اٹھائی جاتی ہے　　اک دل ہی نہیں ساری دنیا مخموری پائی جاتی ہے
اُس بزمِ مقدس و عالی کے آداب جدا ہیں رسم جدا　　ساغر کا سخن یاں ذکر ہی کیا نظروں سے پلائی جاتی ہے

رہا سوال فنی محاسن کا تو کتاب کے مطالعہ سے شاعر کے فکر و فن کا ارتقا واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ احساس پختہ ہونے لگتا ہے کہ ''کیفِ دوام'' کے مصنف کا شعری سفر جب آئندہ مجموعہ کے ''نقشِ ثانی'' تک پہنچے گا تو انتقاد و تجزیہ کی کوئی بھی میزان کلام کو سندِ اعتبار عطا کر دے گی یہ آثار زیرِ نظر مجموعہ میں عروض و لسانیات کے قدر شناسوں کو صاف نظر آ رہے ہیں مثلاً

روح شاداں ہے مدینے کی طرف جاتے ہیں ہم　　خوبیٔ قسمت پہ کیا کیا آج اتر آتے ہیں ہم
سنگِ اسود تیرے بوسے کی تمنا ہے مگر　　یاد آتی ہے سیہ کاری تو شرماتے ہیں ہم
وادیٔ غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں　　ہم کو سمجھتا ہے دل یا دل کو سمجھاتے ہیں ہم

مثل ان کا آج تک نادیدہ ہے　　ان کی صورت کا تو رب گرویدہ ہے
جامِ مازاغ البصر کا ہے سُرور　　آنکھ ہے یا نرگسِ خوابیدہ ہے

کس قدر ہے تابع فرمانِ سرور آفتاب　　اک اشارے میں نکل آیا مکرّر آفتاب
ہر سحر کے وقت لے لے کر گہرہائے نجوم　　روضۂ اقدس پہ کرتا ہے نچھاور آفتاب
دن کو کرتا ہے طوافِ روضۂ خیر الوریٰ　　قبر پر مشعل بکف رہتا ہے شب بھر آفتاب

دیکھا جو نور روئے رسالت مآب کا　　غیرت سے رنگ زرد ہوا آفتاب کا

شہید تیغِ ابروئے نبیؐ ہیں　　کھلے گا حشر میں جوہر ہمارا

پوچھو نہ دل آویزیٔ صحرائے مدینہ　　کانٹا بھی مجھے پھول سے خوش تر نظر آیا

زیر نظر مجموعہ میں تمام روایتی تقاضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ آغاز کلام کے طور پر حمد کا درج ذیل دعائیہ شعر حسن زیدی کی والہانہ آرزوؤں کا مظہر ہے

حسن بھی پیروِ حسان ابنِ ثابت ہے　　جہانِ شعر میں تُو اس کو مستند کرتا

مجموعہ میں سو سے زیادہ نعتیں شامل کی گئی ہیں اور پہلی نعت کا آغاز جس خوبصورت مطلع سے کیا گیا ہے وہ یہ ہے:

مجھ کو مولاؐ نے مقدر کا سکندر رکھا　　دل کو یادِ شہِؐ بطحیٰ سے منور رکھا

اس ضمن میں جو بات خاص طور پر جاذب توجہ ہے وہ صاحب کتاب کا اساتذۂ شعر کے

تتبع کا رجحان ہے چنانچہ انہوں نے متقدمین ومتوسطین اور موخرین ومعاصرین کے مطالعہ کو اپنی فکر شعر کا رہنما بنایا ہے غالب کی زمین میں حسن کے دو شعر ملاحظہ کیجئے:

اے کاش پڑھوں نعت میں دربار نبیؐ میں — سرکارؐ بھی خوش ہو کے یہ فرمائیں کہ "ہاں اور"

اک علم وعمل کا ہے سمندر تہِ سیرت — سمجھو گے تو کھل جائیں گے کچھ راز نہاں اور

روایتی تقاضوں ہی کے سلسلہ میں اپنے مجموعہ کو اختتامی قطعاتِ تاریخ سے مزین کرنے کی سعی بھی کی گئی ہے چنانچہ اس باب میں صنعتِ تضارُب میں کہی ہوئی صابر براری (جن کا انتقال حال ہی میں کراچی میں ہوا ہے اللہ انکی مغفرت فرمائے) کی تاریخ جس سے کتاب کا ہجری سنِ اشاعت ۱۴۲۶ برآمد ہوتا ہے نہایت برجستہ و برمحل ہے:

"کیفِ دوام ایک کتاب جمیل ہے"

آخر میں بے محل نہ ہوگا اگر کتاب میں شامل مصنف کی تحریر بعنوان "سفر نعت" سے ایک ایسا اقتباس پیش کر دیا جائے جو ان کے فکری والہانہ پن اور عمیق جذباتِ ارادت وعقیدت پر مبنی ہے اور جس سے قارئین انکے اشعار میں ایک اضطرابِ پیہم کی تیزی سے کروٹیں بدلتی ہوئی پرچھائیاں دیکھ سکتے ہیں۔ حسن لکھتے ہیں:

"دنیا میں خوشی و سرخوشی" طمانیت اور قلبی سکون کے جتنے مواقع اور سامان موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ خوبصورت اور لطیف لمحہ وہ ہوتا ہے جب مدحت مصطفےؐ کے مضامین میرے قلب وزبان پر نعتیہ اشعار کی شکل میں اتارے جا رہے ہوں۔ ایسے عالم میں مجھے تو کم از کم یہ احساس نہیں ہوتا کہ میں مادی اور خود غرض دنیا میں موجود ہوں لگتا یوں ہے کہ وہاں سے نکل کر کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ یہیں کچھ دیر کے لیے خیمہ زن ہو گیا ہوں"

اِدھر دیکھئے یا اُدھر دیکھئے — انہیں کا ہے جلوہ جدھر دیکھئے

فلک دیکھئے بحر و بر دیکھئے ہیں انوار آقاؐ جدھر دیکھئے
نہ امت کو بھولے کسی حال میں عنایات خیر البشرؐ دیکھئے
حسن آپکے جاں نثاروں میں ہے اسے بھی ذرا اک نظر دیکھئے

دلِ غریب کو بے انتہا خوشی ہوگی جو بارگاہِ رسالت میں حاضری ہوگی
زباں پہ ہوگا صلوٰۃ و سلام کا نعرہ جبینِ شوق ادب سے جھکی ہوئی ہوگی
کبھی نظارۂ گنبد کبھی طوافِ حرم وہ زندگی بڑی راحت کی زندگی ہوگی

ہر گھڑی کھینچتا ہے نفسِ سیہ کار مجھے ہاں بچا لیجئے اب احمدؐ مختار مجھے
کاش وہ پوچھیں کسے شوق ہے پابوسی کا میں کہوں دوڑ کے یا سیدِ ابرارؐ مجھے
دے کے اغیار کی زنجیر غلامی سے نجات کیجئے حلقۂ گیسو میں گرفتار مجھے

ہر چند روکتی رہی در ماندگی مجھے موج ہوائے شوق اڑا لے گئی مجھے
میں جوش و اضطراب میں بڑھتا چلا گیا منزل نگاہِ شوق سے تکتی رہی مجھے

درودوں کے سہرے میں نعتوں کی لڑیاں بڑی شان سے ہم مدینے سدھارے

سرورِ سروراں نبیؐ رہبرِ رہبراں نبیؐ عرصۂ کائنات میں آرزوئے جہاں نبیؐ

رشکِ ریاضِ خلد ہے کوئے مدینہ نبیؐ کوثر و سلسبیل ہے جوئے مدینہ نبیؐ

خلاؤں میں آج اڑنے والو تمہیں یہ شاید خبر نہیں ہے کہ سیکڑوں سال پہلے تم سے حضورؐ پہنچے ہیں لامکاں تک

حسن زیدی جو حسنِ صورت اور حسنِ سیرت سے متصف ہیں شعری محفلوں میں اپنے حسنِ ترنم کی بھی داد پاتے ہیں:

حسن کو لیتے ہیں قدسی حصارِ رحمت میں سنانے بزم میں جس دم کلام آتے ہیں

مراسلات

جناب مختار مسعود۔ لاہور

الاقرباء باقاعدگی سے ملتا ہے شکریہ! میں اسے پابندی اور التزام کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ تازہ شمارہ آج ہی ملا ہے میں نے ابھی صرف اداریہ پڑھا ہے خوب ہے۔ ایک حوالہ چونکہ نادرست ہے اس لئے اس کی نشاندہی کر رہا ہوں صفحہ ۹ پر جو اقتباس مولانا محمد علی جوہر سے کیا گیا وہ سرسید احمد خاں کا ایک مشہور و معروف قول ہے۔ سند کے طور پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی پہلی Convocation کے موقع پر نواب سلطان جہاں بیگم (والیہء بھوپال) کے خطبہ صدارت کی چند سطریں نقل کر رہا ہوں۔

> ''صاحبان! ہماری یونیورسٹی ہماری قومی تمناؤں کا بہترین سرمایہ ہے۔ ہماری بڑی بڑی امیدیں اس سے وابستہ ہیں۔ ہمارے پیش روؤں نے جب اس کی تاسیس کا خیال کیا تھا تو ان کا جو نقطۂ نظر تھا وہ خلاصۃً سرسید مرحوم کے ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ہماری تعلیم اسی وقت مکمل ہو گی جب کہ یہ خود ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں اور سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر ہوگا''۔[1]

خالد یوسف۔ آکسفورڈ (انگلینڈ)

الاقرباء کا جولائی۔ ستمبر شمارہ نظر نواز ہوا۔ بدستور عمدہ اور معیاری تخلیقات سے آراستہ ہے۔ اداریہ 'تعلیم اور قومی تشخص' برمحل ہے اور قوم کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتا ہے' ہمارا نظام تعلیم ہی

---

[1] تصحیح کیلئے ہم ممنون ہیں تاہم ابہام کا سبب مولانا جوہر کی کتاب کی اشاعت ثانی (۱۹۸۱ء) کے دیباچہ نگار پروفیسر منور ابن صادق چیئرمین اسلامک ایجوکیشن ٹرسٹ کے یہ الفاظ ہیں کہ ''مولانا کا یہ تصور تھا کہ سائنس ... تصور تو علی گڑھ کے بانی سرسید احمد خاں کا بھی یہی تھا لیکن عمل کا موقع آیا تو انہوں نے لا الہ کے تاج کو سر پر رکھنے کی بجائے شوکیس میں سجادیا۔'' (ادارہ)

درحقیقت ہماری نجات' فلاح اور ترقی کی کلید ہے اور اس میں بہتری اور یکسانیت پیدا کرنا وقت کی ضرورت ہے اور یہ کام اردو کو اس کا جائز سرکاری مقام دلائے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی کا مقالہ' معاشرے کی تشکیل نو میں ادب کا حصہ' بیحد فکر افروز تحریر ہے۔ ان کا خاکہ 'جیون کتھا' بھی اردو کے حوالے سے سبق آموز ہے۔ ڈاکٹر غلام شبیر رانا کی تحریر علیگڑھ تحریک اور اردو سوانح نگاری بیحد معلوماتی ہے۔ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کا مقالہ "دانش فرنگ' اشتراکیت اور اقبال'' سرمایہ داری اور اشتراکیت کی کشاکش میں اقبال کی متوازن فکر کی نشاندہی کرتا ہے۔ عبدالحمید اعظمی کا خاکہ "یاد قبیلہ پشاور کا" پر لطف اور حقیقت پر مبنی ہے۔ پٹھان بمشکل ہی کسی دوسرے کو پٹھان تسلیم کرنے پر تیار ہوتا ہے جسکا بطور پٹھان مجھے ذاتی تجربہ ہے اور یہ غالباً پٹھان روایات کا حصہ ہے۔

انور شعور کے شعری مجموعے "می رقصم" میں آپ نے شاعر کے فن کا بڑا خوبصورت تعارف کرایا ہے۔ محمود اختر سعید نے بھی محمد داؤد طاہر کے سفرنامہ پنجاب نئی منزلیں پکارتی ہیں پر بڑا فکر افروز تبصرہ کیا ہے اور پنجاب کے حوالے سے حیرت انگیز معلومات فراہم کی ہیں۔ اویس جعفری کا مکتوب فکر انگیز ہے اور اقبال کے اس شعر کی تفسیر ہے کہ ۔

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں ۔۔۔۔ فرنگ کی رگ جاں پنجہء یہود میں ہے

ایک سو اسی یہودی نوبل انعام یافتگان کے مقابلے میں کل تین مسلمان نوبل انعام یافتہ! واقعی یہ ہماری پسماندگی کا نوحہ ہے۔ مشکور حسین یاد صاحب نے افتخار عارف کے تصنع کی جانب اپنے مکتوب میں اشارہ کیا ہے دراصل یہ انکا ہی نہیں سب کا تجربہ ہے۔ اور افتخار عارف کا ایک اپنا شعر انکے اس حسن کردار کا آئینہ دار اور مصدقہ گواہ ہے۔

ہم کہاں اپنے سوا اور کو گردانتے ہیں ۔۔۔۔ ہم نے لکھا بھی تو لکھیں گے قصیدہ اپنا

ڈاکٹر مظہر حامد نے "پروفیسر منظور حسین شور انسانی اقدار کا شاعر" لکھ کر ایک درخشاں ستارے کو برمحل خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ کبھی حیدرآباد (سندھ) میں موتی محل کے مشاعرے

ہیں ہم نے ان سے انکی مترنم نظم ، بادل، سنی تھی جس کی بازگشت ہنوز باقی ہے۔ ریاض حسین چودھری کی حمد عمدہ ہے۔ ع۔ق۔ آور کی نظم بھی دلآویز ہے۔ ڈاکٹر خیال امروہوی کے قطعات دراصل انقلاب کی دستک ہیں۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی کی نظم ایک آرزو ایک دعا خوبصورت ہے۔ عبدالعزیز خالد کی نظم یہ کون سی صدی ہے تمام ملت پاکستان کو افق پر منڈلاتے ہوئے واضح خطرات کے حوالے سے برمحل انتباہ ہے۔ جمیل یوسف کی نظم کیا کوئی ایسی بھی صورت ہے پرکشش ہے۔ غزلیات بیشتر عمدہ ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار خصوصیت سے لائق تحسین ہیں۔

۱۔ تا کہ بشر بشر رہے تا کہ خدا نہ بن سکے نقص ضرور چاہئے آئینہ کمال میں

(ڈاکٹر عاصی کرنالی)

۲۔ مژدہ سنا نہ اے صبا مجھ کو نئی بہار کا دیکھے ہیں میں نے بارہا اسے حسین حادثات

(خیال آفاقی)

۳۔ کوئی کارِ جنوں ہو یا کوئی کارِ خردمندی خلوص دل سے کرتے ہیں اداکاری نہیں کرتے

(صابر عظیم آبادی)

۴۔ حرم ہو دیر ہو بت خانہ ہو کہ راہگذر جہاں پہ خود ہی جھکے دل وہیں جبیں رکھیے

(ضمیر نوری)

۵۔ یہ دور وہ ہے کہ حق گوئی تو کجا دانش ولی ہیں آپ اگر مدحتِ ستم نہ کریں

(عقیل دانش)

۶۔ وہ بتِ کافر رام ہو کیسے تم شاعر وہ پتھر دل منت مانو نذر چڑھاؤ صدقہ دو خیرات کرو

(محمد اویس جعفری)

۷۔ قفس کا در اچانک کھل بھی جائے دوستو لیکن اسیروں کے کھلیں گے بال و پر آہستہ آہستہ

(سہیل اختر)

پروفیسر مشکور حسین یاد۔ لاہور

جولائی ستمبر ۲۰۰۶ء کا شمارہ الاقرباء مجھے مل گیا۔ میں جلدی میں ہوں اس لئے تمام مضامین نظم ونثر مطالعہ نہ کر سکا سب سے پہلے آپکا اداریہ اور مراسلات پڑھے۔ اس بار آپکا اداریہ تعلیم اور ہمارے نظام تعلیم پر ہے۔ بڑے پتے کی اور بنیادی باتیں آپ نے کی ہیں مگر دیکھ لیجئے، عام آدمی کو اور اس کی تعلیم کو ہم کیا کہہ سکتے ہیں جبکہ ہمارے دانشوروں کا یہ حال ہے کہ ایک تو منافقت سے باز نہیں آتے دوسرے اپنے علاوہ تمام لوگوں کو بے وقوف سمجھتے ہیں اور پھر نازک مزاج بھی ایسے کہ چھوٹی موٹی ذرا ان پر تنقید کر دیجئے منہ پھلا کر بیٹھ جائیں گے۔ پچھلے دنوں خبر آئی کہ احمد فراز صاحب نے اپنا ایوارڈ واپس کرنے کا اعلان کیا ہے یا واپس کر دیا ہے۔ آخر اس کی کیا ضرورت تھی جب پہلے وصول کر لیا، تو اب واپس کرنے کے کیا معنی؟ اس لئے کہ پہلے آپ صاحبان اقتدار کے حق میں تھے اور اب صاحبان اقتدار نے آپ کی کوئی غلطی پکڑ لی تو آپ ان سے ناراض ہو گئے۔ میرے خیال میں تو اب ہمارے یہ بہادر اور دلیر شاعر اگر کہیں باہر گئے تو پہلے کی طرح پھر پاکستان کو گالیاں دینا شروع کر دیں گے۔ اگر موصوف حکمرانوں کی مخالفت میں اتنے ہی مخلص ہیں تو وہ کمالِ فن ایوارڈ اور اس کے ساتھ ملنے والی رقم بھی واپس کر دیتے جو انہیں حکمرانوں سے وہ وصول کر چکے ہیں۔ اسی طرح ہمارے پیارے افتخار عارف صاحب نے مجھے خود بتایا کہ جب موصوف کو ہلال امتیاز مل رہا تھا تو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا تھا میں سمجھتا ہوں یہ بھی افتخار عارف صاحب کا تکلف اور عوام کو بے وقوف بنانے والی بات ہے بھئی آپ کو ایوارڈ مل رہا ہے آپ خوشی کے ساتھ وصول کریں اور چپ کر کے بیٹھ جائیں۔ اس کے علاوہ حال ہی میں نصرت زیدی کے ''حرف قدس'' مجموعہ نعت وسلام ومنقبت پر ایک افتتاحی تقریب اسلام آباد کے ہوٹل ہالی ڈے ان میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں نصرت زیدی کی تعریف میں سب لوگ ایک ہی طرح کی باتیں کر رہے تھے جب میری باری آئی تو میں نے کہا حضرات اپنے ایمان سے بتائیے کہ اسی طرح کی باتیں آپ نے کتنی ہزار بار ایسی تقریبات میں سنیں ہیں۔ میں نے افتخار

عارف صاحب کا نام خاص طور سے لیا کیونکہ ایک تو وہ اہل قلم کے ادارہ کے صدر نشین ہیں، دوسرے عمدہ شاعر ہیں، میری اس طرح کی باتوں کو سراہیں گے۔ میں نے نصرت زیدی کا یہ مجموعہ اشعار چونکہ محمد آل محمد کی ذواتِ مقدسہ سے منسوب ہے اور ہم سب جانتے ہیں محمد و آل محمد کی ہم مدح کر ہی نہیں سکتے یہ ایسے باکمال لوگ ہیں کہ ہم جو بھی تعریف کریں گے وہ ناقص ہی رہے گی۔ میں نے دیکھا کہ میری اس بات پر مجھے داد کم ملی اور لوگ پریشان زیادہ نظر آئے۔ اس کے علاوہ ہم اہل قلم بھی ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ جس ملک کے اہل قلم اور دانشوروں کا یہ حال ہو وہاں کا نظام تعلیم کیسے درست ہو سکتا ہے۔ یوں آپکا چیخنا چلانا اپنی جگہ ایک حیثیت تو بہرحال رکھتا ہے۔

مراسلات میں ڈاکٹر خیال امروہوی نے حسب معمول سوچنے سمجھنے کی باتیں کی ہیں۔ اس کے علاوہ حسن عسکری کاظمی ماشاء اللہ پڑھتے بھی جلدی میں ہیں اور لکھتے بھی جلدی میں ہیں' کیا رواں دواں خط آپ کو لکھ مارا ہے۔ جناب شریف کنجاہی کا خط غور طلب ہے ان کے علاوہ دوسرے صاحبان بشیر حسین ناظم محمد اویس جعفری سید حبیب اللہ بخاری خالد یوسف نے کام کی باتیں لکھی ہیں، کرامت بخاری صاحب کا کیا ذکر کروں موصوف نے تو میرا دل بڑھانے کے لئے بہت کچھ لکھ دیا۔ اور ہاں اس دفعہ اپنے انداز کی ایک نعت بھیج رہا ہوں۔ اور اپنے ہی انداز کی دو غزلیں بھی ایک غزل میں تو میں نے زبان کو خاصی کروٹیں دی ہیں' یہی حال دوسری غزل کا بھی ہے۔ اب پھر آپکے حوصلے کی بات درمیان میں آن پڑی ہے۔

ڈاکٹر مظہر حامد۔ کراچی

معذرت کے ساتھ عرض یہ ہے میرا نام ڈاکٹر مظہر حامد ہے مظہر جاوید نہیں یقیناً یہ سہو ہوا ہے۔ غزلیات کے حصے میں بھی مظہر جاوید تحریر ہوا ہے۔ نام درست کر لیجئے گا۔ (۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون ''سائنسی دور میں شاعری کا مستقبل'' نہایت عمدہ پر مغز اور

---

۱ کمپوزنگ کے اس سہو کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں (ادارہ)

دقیع ہے۔ ڈاکٹر صاحب زبان و بیان پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ خیالات کی ترسیل میں بھی فنی مہارت اور ندرت بیان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر معزالدین کا مضمون ڈاکٹر عندلیب شادانی کی تنقید نگاری پر بصیرت افروز اور تحقیقی ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ حصہ نظم میں شاعری نہایت جاندار اور دلکش ہے۔ شعراء نے زیادہ تر عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھا ہے جس سے معاشرتی اور سماجی اقدار کا اندازہ ہوتا ہے۔

الاقرباء نے بہ اعتبار معیار شاعری کا چناؤ عمدہ طریقے سے کیا ہے۔ جن شعراء کی غزلیں فنی مہارت کے زمرے میں آتی ہیں یا جنہیں اساتذہ فن کہا جاتا ہے ان میں عاصی کرنالی، خیال آفاقی، مضطر اکبر آبادی، سہیل غازی پوری، حسن عسکری، کی غزلوں میں بانکپن، سوز و گداز، عصری میلانات، اور دور حاضر پر تنقیدی بصیرت نمایاں ہے۔ نقد و نظر، تبصرہ کتب میں منصور عاقل صاحب نے جس خوبصورت انداز میں کتاب ''بر سبیل سخن'' پر تبصرہ فرمایا ہے وہ یقیناً ان کے ذہنی افق کا پھیلاؤ ہے۔ تحریر میں شگفتگی اور شائستگی ہر سطر سے عیاں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ منصور عاقل ایک جہاندیدہ ادب پرور سخن فہم اور سخن شناس ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ شعر و ادب میں ان کی مساعی اور انتھک محنت ہی ''الاقرباء'' کی کامیابی کی ضامن ہیں۔ الاقرباء ایک خوبصورت دیدہ زیب اور ادبی معیار کا حامل مجلّہ ہے۔ جس نے کم عرصہ میں اتنی سرعت سے ترقی کی ہے کہ اس قدر قلیل مدت میں کوئی رسالہ اتنا معروف نہ ہو سکا۔

پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی۔ لیہ (پنجاب)

جولائی کا شمارہ الاقرباء عروس زرنگار کی طرح کشاف علم و داب ثابت ہوا۔ الاقرباء دیدنی و لاثانی۔ ہر نثر پارہ بہ اعتبار موضوع اعماق افکار کی خبر لادے منظوم تخلیقات دل کو بہجت، ذہن کو ندرت، آنکھوں کو بصارت و بصیرت عطا کریں، اس عہد مرفوع القلم میں چند جرائد ہی رہ گئے ہیں جو سنگین گرانی اور فکری سرگرانی کے باوجود جلوہ بار ہیں۔ الاقرباء ان سیارگانِ ادب میں مثل عطارد ہر تین ماہ بعد ادبی کہکشاؤں کو سمیٹے سرفہرست نظر آتا ہے۔

قبلہ عاصی کرنالی اور علامہ عبدالعزیز خالد کے مقرّس ومعرّب کلام سے استفادے کا موقع ملتا ہے، عاصی کرنالی کی طبع رواں، انشائے بیکراں، معلومات کا خزینہ، لطافت تخلیق کا گنجینہ اس طرح الاقرباء ادیبوں، شاعروں، محققوں، مفسروں، مترجموں کی قرابت سے قلم قبیلہ بنانے میں جس انداز، جس انہماک کا ثبوت دے رہا ہے اسکا سہرا منصور عاقل صدر نشین الاقرباء فاؤنڈیشن کے سر ہے۔ ''لازماں سے زماں تک'' کتاب پر مختصر اور علم افزاء تبصرہ کا شکریہ۔ عزیزی جسارت خیالی کی ہمت وجسارت ہے کہ حسب توفیق کچھ سوانح جمع کر لیے، وگرنہ زندگی خود اس قدر سنگین حادثہ بلکہ فاجعہ ہے کہ اسکے نشیب وفراز کو بیان کرنا صرف جوش ملیح آبادی کا ہی حصہ تھا۔ دراصل ''لازماں سے زماں تک'' کے نام کو کسی نے پوری طرح سمجھا نہیں۔ انسان جب عدم میں ہوتا ہے تو لازماں میں ہوتا ہے ولادت کے بعد زماں میں آتا ہے۔ اور پھر گردشِ لمحات کے اختتام پر دوبار لازماں یعنی عدم میں چلا جاتا ہے گویا اسکا اول وآخر کالعدم کے مصداق ہے۔ اب زمانے کی کوئی توجیہہ نہیں ہوسکتی، کب سے ہے، کب تک رہیگا، مفرد ہے مرکب ہے اگر زمانہ ہی خدا ہے تو لمحات کی بقا اور فنا کیا ہے ہم ہیں بھی تو کیوں ہیں، اگر نہیں ہیں تو پھر ہونیکی منزل اور مرحلے میں کیسے آ گئے، زمانہ کا مادی وجود بھی ہے جسے انسان محسوس کرسکتا ہے دیکھتا ہے زبان سے ذوق اور ذائقہ کی تکمیل کرتا ہے ''اسکے باوجود وہ'' لایعنی نفی کی منزل میں رہتا ہے۔ اور پھر لازماں میں چلا جاتا ہے یہ وضاحت بھی کچھ صحیح نہیں، اپنی اپنی اختراع ہے وگرنہ زمانے کو انسان نہ ولادت سے قبل جانتا ہے نہ پس از مرگ کہ کیا ہے اسکا بھی اسے کوئی علم نہیں ہوسکتا، گویا لازماں اور زماں کے درمیان جو ہوتا ہے اسے بھی فلسفے کی اصطلاح میں لاادریت کہنا زیادہ مناسب ہے۔

ڈاکٹر انور سدید۔ لاہور

''الاقرباء'' کا جولائی سے ستمبر ۲۰۰۶ء تک کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس کرم کے لیے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ الاقرباء شاید اردو زبان کا پہلا جریدہ ہے جس نے آمدنی اور اخراجات کا گوشوارہ شائع کرکے اس بات کا اثبات کیا ہے کہ یہ خسارے میں نہیں جا رہا' اور ادب کی خدمت

میں زیاں کا شکار نہیں (ا)۔ اس کا یہ زاویہ بھی متاثر کرتا ہے کہ مضامین اور مراسلات کا حصہ مدیر کی ستائش بے جا سے عاری ہے اور مراسلات لکھنے والے اپنی رائے کا اظہار کھل کر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جناب مشکور حسین یاد نے اس توقع کو غلط قرار دیا ہے کہ ادیب اور شعراء جیسے لکھنے میں نظر آتے ہیں' ویسے ہی وہ عام زندگی میں ہوں گے۔ اور ثبوت فراہم کیا ہے کہ احمد فراز عموماً بیرون ملک کے مشاعروں میں اپنے علاوہ دوسرے شاعروں کا مذاق اڑانا اپنی خوبی سمجھتے ہیں یا منیر نیازی دوسرے شاعروں کو داد دینا گناہ سمجھتے ہیں' ان کی صاف گوئی کی داد دی جا سکتی ہے لیکن افتخار عارف صاحب کے بارے میں ان کا یہ تصور محل نظر ہے کہ

''وہ بظاہر ملتے بھی بڑے زور سے ہیں' مگر مجھے ہمیشہ ان کے ملنے ملانے میں تصنع ہی نظر آیا''

ان کا ارشاد ہے کہ کبھی ان سے یہ بات مجھے ضرور پوچھنی ہے۔ استدعا ہے کہ پوچھ لیں اور جب افتخار عارف اس کی وضاحت کر دیں تو الاقرباء کے قارئین کو اس بارے میں ضرور باخبر کریں۔

''تعلیم اور قومی تشخص'' کے زاویے سے اداریہ گہرے قومی جذبے سے لکھا گیا ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے حکمران قائد اعظم اور اقبال کے تصورات ہی سے انحراف نہیں کر رہے بلکہ ان مقاصد کی بھی نفی کر رہے ہیں جن کے لیے پاکستان تشکیل دیا گیا تھا۔ اور اب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قوم کو جاہل مطلق رکھنے کے ایجنڈے پر کام ہو رہا ہے۔ تعلیم قومی ترجیحات میں پست سے پست تر ہو چکی ہے۔ کیا مولانا محمد علی جوہر کی یہ آواز: ''سائنس ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگی' اور فلسفہ ہمارے بائیں ہاتھ میں اور ہمارے سر پر ایک تاج ہوگا جس پر 'لا الہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ'' لکھا ہوگا۔'' ہمارے حکمران سننے اور اس پر عمل کرنے کی زحمت کریں گے۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی صاحب نے ''معاشرہ کی تعمیر نو میں ادب کا حصہ'' کے عنوان سے فکر

ا۔ یہ حقیقت ماضی میں بھی ہم ایک سے زیادہ بار واضح کر چکے ہیں کہ سہ ماہی 'الاقرباء' کے مقاصد تجارتی ہیں نہ ذاتی منفعت مجلہ ہذا کو ادارتی قلمی اور دیگر متعلقہ خدمات تمام تر اعزازی طور پر حاصل ہیں چنانچہ بجز طباعتی اخراجات دیگر مصارف صفر ہیں (ادارہ)

انگیز مقالہ لکھا ہے' لیکن جب ادب کو معاشرے کے ارتباط سے دور کیا جا رہا ہے تو معاشرہ منقلب کیسے ہوگا۔ دوسری طرف اب ادب لکھنے والے ہی اس کے قاری ہیں تو کیا معاشرے کو منقلب کرنے کے لیے پہلی مثال خود ادیب کو پیش نہیں کرنی چاہیے؟ جبکہ آج کا ادیب سگ دنیا بنا ہوا دولت کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔۔۔ میں محترمہ زاہدہ حنا اور سعد اللہ خان برق کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' کا ایوارڈ جس کے ساتھ اب تین لاکھ روپے کا انعام بھی منسلک ہے واپس کر دیا' اور اپنا رشتہ عوام سے اور اپنی سرزمین وطن سے باندھا جس کی ٹیکسوں کی دولت کو کارکنانِ حکومت بے تحاشا ضائع کر رہے ہیں۔ کہنے کو تو احمد فراز نے بھی اپنا ایک ایوارڈ واپس کر دیا ہے لیکن انہوں نے اس ایوارڈ کے تمام مفادات حاصل کرنے کے بعد یہ اقدام کیا تو اس میں ان کا جذبہ تشہیر اور مخصوص انداز کے مقاصد وابستہ ہیں۔ اور یہ سستی شہرت حاصل کرنے کا حربہ ہے جبکہ انہوں نے بقول نذیر ناجی فوجی وزیروں سے جو نقد رقوم حاصل کیں' وہ واپس نہیں کیں۔ احمد فراز شاعر جیسے بھی ہیں وہ کسی اخلاقی معیار پر کبھی پورے نہیں اترے۔ دوسری طرف بعض لوگ الزام لگاتے ہیں کہ جن شاعروں پر حدود کا مقدمہ قائم ہونا چاہیے انہیں بھی قومی ایوارڈ دے دیئے جاتے ہیں اور جس شاعری پر کوڑوں کی سزا دی جانی چاہیے' وہ انعام سے نوازی جاتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہماری ساٹھ سال کی تاریخ ترقی معکوس کی داستان ہے۔ نئی نسل کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیا گیا ہے اور آزادی سے قبل کے گنے چنے لوگ مرثیہ خوانی میں مبتلا ہونے پر مجبور ہیں۔ غنیمت ہے کہ ''الاقرباء'' درد کا اظہار کر ڈالتا ہے کہ کہیں سے کوئی آواز تو اٹھ رہی ہے۔

میں ''دبستان قابل'' پڑھ رہا تھا' ان کے حالات حیات میں یہ پڑھ کر شدید دکھ ہوا کہ ان کی زندگی کے آخری برس میں اکادمی ادبیات پاکستان نے ان کا وظیفہ دو تین صد روپے مقرر کیا اور وہ ناداری میں ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ میں نے اس کتاب کے مطالعے کے بعد ان پر مضمون لکھ کر اپنا غم ہلکا کرنے کی کوشش کی' یہ مضمون ارسال خدمت ہے۔ ڈاکٹر افضل مرزا مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ''الاقرباء'' کی آواز انگریزی دنیا میں پھیلا دی۔

پروفیسر حسن عسکری کاظمی۔ لاہور

الاقرباء کا شمارہ جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۶ء میں یوں تو مضامین و مقالات ایک سے ایک بڑھ کر معلومات افزا تھے لیکن میرے استاد محترم اور محسن پر "پروفیسر منظور حسین شور انسانی اقدار کا شاعر" ڈاکٹر مظہر حامد کا مضمون کمال عقیدت و محبت سے پڑھا اور اپنی یادوں کو تازہ کیا۔ وہ زمیندار کالج گجرات میں تھے' میں نے ان کے سامنے زانوائے تلمذتہ کئے' یہ ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے کہ میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوا' سیکنڈ ایئر میں انہوں نے مجھے کالج میگزین کا ایڈیٹر منتخب کیا۔ تحریری مقابلہ ہوا جس میں میرے کلاس فیلو راحت ملک بھی امیدوار تھے' وہ سمجھتے تھے کہ ایڈیٹر کے انتخاب میں قرعہ فال ان کے نام پڑے گا مگر ایسا نہ ہوا' پروفیسر منظور حسین شور کا فیصلہ پسند نہ آیا' راحت ملک ان کی کلاس میں آئے اور لیکچر کے درمیان اٹھ کر چلے گئے' انہوں نے ایک جملہ کہا کہ عدم شائستگی کا مظاہرہ خود اس کے حق میں نقصان دہ ہے' انہوں نے راحت ملک سے کوئی پرسش نہیں کی' اس چھوٹے سے واقعے میں پروفیسر منظور شور کا رویہ اور طرز عمل مجھے بہت پسند آیا بلکہ میرے کام آیا۔ ان پر ہر وقت بے خودی' وارفتگی اور بے نیازی سی طاری رہتی تھی۔ وہ اکثر اپنے من میں ڈوبے رہتے۔ ان کی یہ ادا مجھے بہت بھاتی۔ پڑھاتے ہوئے یوں لگتا کہ جیسے ان پر الہامی کیفیت طاری ہو چکی ہے خصوصاً شاعر مشرق علامہ اقبال کے اشعار کی شرح کرتے ہوئے جس بلندی سے بات کرتے وہ ان کی قامت فکر کی رفعتوں سے ہمکنار کر دیا کرتی' کبھی کبھی وہ اپنی نظم سناتے یا غزل کا شعر پڑھتے تو میں ہمہ تن گوش ہو جاتا' ان کے اشعار میں معنویت کی تہیں کھولتے ہوئے لطف آتا۔

سو ہنگامے ایک سکوت — رہ گئی دل میں دل کی بات
شور تری جبیں پہ ہیں — چند سجدوں کے الزامات

ڈاکٹر مظہر حامد کا یہ کہنا درست ہے کہ "ان کی نظموں میں عصری گونج' جذباتی ردعمل اور خود اعتمادی کا جو اظہار ہمیں ملتا ہے وہ داخلی اور خارجی احساسات ہیں' یہی وہ جذبہ ہے جس کے تحت وہ انسان کو متحرک اور انسانی اقدار و وقار کو فعال بناتے ہیں' انہوں نے اپنے عہد کے تضاد کو

بڑی خوبصورتی سے نظموں میں پیش کیا ہے۔'' پروفیسر منظور حسین شور ۱۹۵۲ء میں گجرات سے لائل پور (فیصل آباد) گورنمنٹ کالج تشریف لے گئے وہ اکیلے نہیں بلکہ پروفیسر تاج محمد خیال (پرنسپل) پروفیسر بدرالدین (لیکچرار انگریزی) پروفیسر سعید لیکچرار معاشیات بھی زمیندار کالج چھوڑ گئے' ان اساتذہ کے رخصت ہونے کے بعد کالج بے رونق ہو گیا۔

ثمر بانو ہاشمی کا مضمون ''جناب فاطمہ زہرا ؓ تاریخ و تہذیب کے آئینے میں'' مختلف حوالوں سے نہایت وقیع اور رنگِ عقیدت کا مظہر دکھائی دیا جسے پڑھتے ہوئے بنت رسول مقبول صلعم کی سیرت و کردار کی عظمت کا راز کھلا' علامہ اقبال کے اشعار کی برمحل تزئین سے مفاہیم اور بھی روشن ہو گئے' ثمر بانو ہاشمی نے حق مودت ادا کر دیا۔ اس شمارے میں جناب عاصی کرنالی کا مضمون اور خاکہ نہایت دلچسپ ہونے کے علاوہ انکے منفرد اسلوب کا آئینہ تھا' اسی طرح دوسرے مضامین بھی الاقرباء کے قارئین کو پسند آئے ہونگے' حمد و نعت' غزل اور رباعی غرض ہر صنف کے اعلیٰ نمونے اور آپ کا اداریہ کیا کچھ پڑھنے کو ملا جس کیلئے آپ کی محنت اور محبت لائق صد ستائش ہیں۔

پروفیسر صدیق شاہد۔ شیخوپورہ

چند روز قبل خوش منظر ''الاقرباء'' موصول ہوا۔ میں نے اپنی کسی دردناک مصروفیت کی وجہ سے اسے کافی تاخیر سے پڑھا۔ پڑھ کر لطف اندوز ہوا ہوں۔ مختلف النواع تحریریں آپکے اداریے سمیت دل کو بھا گئیں۔ اداریے میں آپ کی وسیع النظری اور دردمندی کی روِنے بہت متاثر کیا۔ جبکہ مقالات و مضامین، خاکے وغیرہ اور شاعری میں حمد و نعت سے لیکر غزلیات و دیگر منظومات نے ذوق کی خوب خوب تسکین کی۔ خوش قسمتی سے آپ کے ہاں منجھے ہوئے اہل قلم کی کہکشاں موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ ''الاقربا'' کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر بن کر طلوع ہو رہا ہے بہرہ نقد و نظر میں آپ کے علاوہ بعض دیگر اہل قلم کتابوں کے تعارف میں حق نقد ادا کر رہے ہیں جب کہ مراسلات کی اپنی ادبی قدر و قیمت ہے۔ یہ حصہ ادب افروز بھی ہے اور ادب آموز بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حصہ اہل ذوق کی علمی و ادبی تربیت میں یقیناً معاون ثابت ہو رہا ہے۔ شاعری

میں غزلوں کے ان اشعار نے بطور خاص مجھے محظوظ کیا:

گم ہوئے کتنے رابطے گردشِ ماہ و سال میں اب ترا نام بھی نہیں حاشیۂ خیال میں

(عاصی کرنالی)

اس پہ چلتے ہی چلے جاؤ کہ شاداب رہو جو کبھی ختم نہ ہوگی وہ مسافت ہے یہ جان

(مشکور حسین یاد)

پھرتی ہیں در بدر لئے مجھ کو یہ میری خواہشات تیری وہی عنایتیں' میرے وہی تحفظات

(خیال آفاقی)

ساعتِ ہجر میں پھر سانس چلی پھر تری یاد کا طوفان چلا

(کرامت بخاری)

صدیوں سے اک شب ہے صبحو گھونگٹ کھولو

(جعفر بلوچ)

منصور صاحب' پچھلے دنوں میرا تازہ مجموعہ کلام ''خواب سرا'' شائع ہوا ہے' اس کی دو کاپیاں ارسال کرتا ہوں' میری خواہش ہے کہ اس پر آپ ''الاقرباء'' میں تبصرہ رقم فرمائیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔ اپنی دو غزلیں بھیج رہا ہوں' اگلے شمارے میں شامل کیجئے گا۔

پروفیسر زہیر کنجاہی۔ راولپنڈی

آپ کے اداریوں نے نیرنگ خیال کی روایت کو احیاء بخشی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اداریہ ہی پرچے کی جان ہوتا ہے۔ اداریہ ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدیر محترم کے سوچنے کا انداز کیسا ہے اور وہ اپنے جریدے کے ذریعے اردو ادب اور قارئین کی کیا خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ موجودہ شمارے کے اداریئے میں آپ تو معاصر ادب میں فکری و نظریاتی بے اعتدالی کا رونا رو رہے ہیں، میں تو اس امر کو بھی اردو ادب کے لئے زہرِ قاتل سمجھ رہا ہوں کہ معاصر ادب میں دن رات کمی ہی کمی واقع ہو رہی ہے۔ کمپیوٹر کا دور دورہ ہے۔ فلاپی اور سی ڈی کی بادشاہی ہے انٹر نیٹ فیکس اور ای میل کا زور ہے۔ ایک کتاب جب پرنٹ ہو کر آتی ہے تو مسلسل پچاس سالوں

تک لوگوں کے ذہن پر حکومت کرتی ہے۔ ادھر سی ڈی میں شامل ہونے والی کتاب کب تک زندہ رہے گی؟ دو چار ماہ اور بس! کتاب پرانی بھی ہو جائے تو بھی لائبریریوں اور کتب خانوں میں موجود رہتی ہے مگر سی ڈی سے تو تحریر ہی مٹ جاتی ہے۔ ریکارڈ کہاں رہے گا؟ اور حوالہ جات کہاں سے آئیں گے۔ گویا صرف معاصر ادب ہی میں کمی نہیں ہوگی۔ تحقیق کا پڑاؤ بھی کم سے کم تر اور پھر کمترین ہوتا جائے گا۔

ڈاکٹر انور سدید نے مولانا ظفر علی خان پر ایک جامع مقالہ لکھ کر اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ زندہ قومیں اپنے محسنوں کو نہیں بھولتیں۔ آج سے دس پندرہ برس قبل میں نے ماہنامہ ''سیارہ'' لاہور میں لکھا تھا کہ اردو ادب کی کئی جہتوں کا نام انور سدید ہے، ایک زمانہ تھا کہ لاہور میں ظفر علی خان، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر اور چراغ حسن حسرت کی چوکور موجود تھی جو ہر فن مولا تھے۔ شاعری وہ کرتے تھے۔ صحافت ان سے زندہ تھی۔ کالم نگاری کا آغاز انہوں نے کیا۔ جناب سالک اور حسرت نے مزاحیہ و فکاحیہ کالم لکھے اور خوب لکھے۔ مولانا ظفر علی خان تو جو کبھی لڑتے تھے۔ حاکموں سے ٹکر لی، اور ان کو بھگا کر چھوڑا۔ مولانا ظفر علی خان کے سامنے انگریز کی مکاری اور ریا کاری سب فیل ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں چار میں سے کسی ایک کی روح انور سدید میں حلول ہو چکی ہے۔

وطن کے خدو خال کے تحت تو ید ظفر ملک کے مختلف مقامات کے بارے میں لکھتے رہتے ہیں۔ موجودہ شمارے میں انہوں نے راولپنڈی کے بارے میں لکھا ہے۔ عنوان: راولپنڈی (وطن کے خدو خال) دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی کہ شاید اپنا مقصود مل جائے مگر ہر لکھنے والا میرے مقصود کو نظر انداز ہی کر جاتا ہے۔ راولپنڈی میں ایک علاقے کا نام ہے لالکڑتی جسے آج کل کنٹونمنٹ بورڈ والوں نے ''طارق آباد'' میں تبدیل کر دیا ہے۔ میں اس لالکڑتی نام کی وجہ تسمیہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کسی مستند اور معیاری حوالے کے ساتھ! میری کتاب محبت اور خون (افسانے) پر تبصرہ کرنے کا شکریہ!

مکتوب ثانی

الاقرباء شمارہ جولائی ستمبر کے سلسلہ میں سب سے پہلے میں سمجھتا ہوں کہ الاقرباء کے مراسلے ہر گذشتہ شمارے پر مکمل تنقید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کا اداریہ ایک مکمل اور مناسب ہدایت نامہ ہے مسلمان اگر بہ عزت زندگی گذارنا چاہتے ہیں تو قرآن کو لائحہ عمل بنانا ضروری ہے مگر ہمارے ہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ رہی ہے۔ محکمہ تعلیم کو تو افسران بالا قرآنی تعلیم ہی سے مبرا کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں آج اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ خود کو پہچاننے کے لئے تعلیم بے حد ضروری ہے۔ لہٰذا جیسی تعلیم ہوگی ہم ویسا ہی ہوں گے، اور ویسا ہی رہیں گے۔ انسان جب تک اپنی اصلیت ہی سے آگاہ نہ ہو، دوسروں کے لئے کیا تجسس کرے گا؟ میں نے ۱۹۵۰ء سے آج تک تعلیمی امور ہی سرانجام دیتے ہوئے نصف صدی سے زیادہ عمر گزاری ہے۔ اگر اس پر لکھنے بیٹھوں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ مختصراً اتنا ہی کہونگا کہ اگر ہماری قوم مولانا محمد علی جوہر کا پیش کردہ نصاب تعلیم اور ایئر مارشل نور خان کی تعلیمی پالیسی کو ملا کر ایک نیا وطیرۂ تعلیم اختیار کرے تو دنیا کی کوئی قوم پاکستانی قوم کو تعلیمی میدان میں شکست نہیں دے سکتی۔ سب سے پہلے دو طبقاتی تعلیم ختم کی جائے۔ اردو کو قومی زبان سمجھتے ہوئے ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ تعلیمی امور سرانجام دینے والے اداروں میں انگوٹھا چھاپ افسر مقرر نہ کیے جائیں۔ محکمہ تعلیم میں ان لوگوں کو ذمہ داریاں دی جائیں جو اسلامی تعلیم سے بہرہ ور ہوں اور پستی سے بلندی کی طرف گامزن ہوں۔ کسی بھی فوجی افسر کو ریٹائرمنٹ کے بعد کسی بھی تعلیمی ادارے (خواہ وہ پرائمری سکول ہی کیوں نہ ہو) کا سربراہ مقرر نہ کیا جائے۔

ہماری سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ آج ہمارے اکثر تعلیمی اداروں کے سربراہ وہی ہیں جو ایف اے کرنے کے بعد افسر بنتے ہیں اور جب بہت بڑے عہدے سے ریٹائر ہوتے ہیں تو قومی زبان کا ایک لفظ نہ لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں۔ انگریزی فرفر بولتے ہیں۔ ہمارا نصاب تعلیم آج تک صحیح نہیں ہو سکا۔ صرف اس لئے کہ نصاب کو مقرر کرنے والے انگلینڈ ریٹرن یا امریکی پٹھو ہوتے ہیں۔ اور انہیں اپنی معاشی، معاشرتی، مذہبی، علمی اور تعلیمی اقدار کا بالکل علم نہیں ہوتا۔

آپ نے پورے رسالہ میں ایک بھی افسانہ نہیں دیا۔ ایسا نہ کیا کیجئے پہلے ہی اردو کے پاس لے دے کر اور ہے ہی کیا؟ کوئی کامیاب ناول یا افسانہ وہ بھی کبھی کبھار اور بس، تنقید صرف تعریف ہو کر رہ گئی ہے اور تحقیق کو سی ڈی نابود کرے گی۔ آپ نے ایک کے بجائے دو خاکے شامل کیے ہیں، وقتی طور پر انہیں ہی افسانے سمجھ لیا جائے تو کام چل سکتا ہے۔ باقی تخلیقات بھی جامع اور قابل مطالعہ ہیں۔ الاقرباء اللہ کے فضل سے ترقی وارتقاء کے راستے پہ گامزن ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی اس ارتقاء میں مزید اضافہ کریں۔ آمین

کرامت بخاری۔ لاہور

الاقرباء نظر نواز ہوا حسب روایت مقالات سے مکتوبات تک علمی وادبی تحریریں پڑھنے کو ملیں، محترم بشیر حسین ناظم کی علمی وادبی تحقیقات کا معترف ہوں جناب مشکور یاد حسن عسکری ڈاکٹر خیال امروہوی، عبدالعزیز خالد صاحب سب لوگ ہمارے سینئرز ہیں اور ان کی ساری زندگی اردو ادب کی ترقی، ارتقاء اور ترویج میں گزری ہے۔

منظومات، نثریات اور غزلیات بھی معیاری اور عصری شعور سے معمور ہیں ہمیں کسی بھی شخصیت سے اختلاف ہو سکتا ہے، مگر اس کی زندگی بھر کی محنت اور ریاضت سے انحراف ممکن نہیں صفدر جعفری عاصی کرنالی اور مضطرا کبر آبادی کا کلام پسند آیا عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں بہت سے لفظ مشترک ہیں بلکہ اردو مفرس بھی ہے اور معرّب بھی یعنی اردو نے فارسی اور عربی سے استفادہ کیا ہے اس لئے اکثر احباب فارسی تراکیب یا عربی الفاظ کی بندش میں غلطی کر جاتے ہیں۔ خیر یہ علمی گفتگو باعث عزت ہے، ثمر بانو ہاشمی کا سیدہ سلام اللہ علیہا پر اچھا مضمون ہے۔

کوئی بھی صنف بذات خود نہ تو اچھی ہے اور نہ بری اصل بات فکر و مشاہدہ اور سوچ کی ہے۔ الفاظ کے دروبست کی ہے، ترنم غنائی نظام اور قافیہ ردیف کی تام جھام کی ہے۔ یا پھر اثر پذیری کی ہے۔ یا لوگ نظم کو لے کر جذبات میں اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ غزل کو مطعون ٹھہرایا جا رہا ہے۔ یہ بحث برائے بحث ہے، لایعنی بات ہے، نظم نظم ہے اور غزل غزل، باقی مخمس، مسدس،

رباعی، قطعہ، ہائکو، ماہیہ، نوحہ، مرثیہ، قصیدہ، واسوخت، شہر آشوب، مثنوی، دوہا، نظم معریٰ، نثری نظم سب اظہار کے ذرائع ہیں۔ البتہ نثری نظم ذرا عجیب بات ہے میں اسے نظمی نثر کہتا ہوں، خیر اسے عجز اظہار کی صورت قرار دیا جاسکتا ہے، کسی بھی مصنف کو قصوروار ٹھہرانا یا اس کے پیچھے لٹھ لے کے دوڑ پڑنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

صوفیہ یوسف۔ خیر پور (سندھ)

سہ ماہی الاقرباء علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کو بہت خوبصورت انداز میں آگے بڑھا رہا ہے جس کے لئے آپ اور الاقرباء فاونڈیشن مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میں اس مجلے کی قاری ہونے کے ناطے اس کی علمی و تحقیقی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے الاقرباء فاونڈیشن کی رکنیت حاصل کرنا اپنے لئے اعزاز سمجھتی ہوں۔ اس سلسلے میں امید ہے کہ رہنمائی فرمائیں گے۔

سید انتخاب علی کمال۔ کراچی

اداریہ ''تعلیم اور نظام و نصاب کے مسائل'' میں آپ کا ارشاد بجا ہے کہ اردو زبان کے بارے میں ہمیں اپنا رویہ بہتر کرنا چاہئے۔ انگریزی کو اختیاری اور اردو کو سرکاری و قومی زبان کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اپنے مضمون ''سائنسی دور میں شاعری کا مستقبل'' میں کوزے میں دریا بند کیا ہے۔

اداریہ اور ڈاکٹر جالبی کے مضمون کے علاوہ سرسری نظر سے مراسلات دیکھے ہیں۔ مراسلات میں ڈاکٹر غلام شبیر رانا صاحب نے جھنگ سے، خالد یوسف صاحب نے آکسفورڈ برطانیہ سے اور سید حبیب اللہ بخاری صاحب نے بھاولپور سے میری نظم ''بیٹی'' کو نظم مُرصّع اور معنویت کے اعتبار سے اعلیٰ مقام کی حامل قرار دیا ہے۔ یہ ان کا حسن ظن ہے۔ ان کرم فرماؤں کا شکریہ۔

ایک طویل تحقیقی مقالہ ''فن تاریخ گوئی کی ایک سو کتابوں کا جائزہ'' کے عنوان سے ارسال کررہا ہوں۔ اگر آپ کے اعلیٰ معیار پر پورا اُترے تو ''الاقرباء'' میں جگہ دیجئے گا۔ فن تاریخ گوئی پر آپکی اور الاقرباء کی خدمات لائق تحسین ہیں۔

محمود رحیم۔ اسلام آباد

الاقرباء کا شمارہ جولائی ستمبر ۲۰۰۶ موصول ہوا۔ نہایت شکریہ! مراسلات میں جناب کرامت بخاری نے میری صحت کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے جس پر میں ان کا ممنون ہوں۔ خدا ان کو بھی صحت، رزق اور عمر سے نوازتا رہے۔

جناب محمد اویس جعفری صاحب نے لفظ ''رجز'' کے صحیح تلفظ کی نشاندہی پر ممنونیت کا اظہار کیا ہے یہ اُن کی کشادہ ظرفی ہے۔ ورنہ آج کل یار لوگ بجائے اظہار تشکر کے مختلف تاویلوں کی دھند میں چھپنے کی سعی کرتے ہیں۔ ایک حمد اور ایک غزل ارسال کر رہا ہوں۔

سید حبیب اللہ بخاری۔ بہاولپور

''تعلیم اور قومی تشخص نظام و نصاب کے مسائل'' کے عنوان پر آپ کا اداریہ ہر صاحب علم کے احساسات کا ترجمان ہے۔ کاش کہ صاحبانِ بست و کشاد کو اس ادراک کی توفیق نصیب ہو کہ نونہالانِ قوم کو کس نوعیت کے علمی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اور اس کی فراہمی کیلئے وہ کیا جستجو کر سکتے ہیں اس وقت اہل کلیسا کا نظام تعلیم رائج ہے جس کے بارے میں شاعرِ مشرق نے فرمایا تھا کہ

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

ہم آزادی کی نعمت سے فیضیاب ہوئے مگر اپنے نظریہ پر عمل پیرا نہ ہو سکے۔ اپنی مذہبی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا تصور دیا گیا تھا مگر اپنے قائدین کے نظریاتی عہد پیان کو پورا کر سکیں ہمیں توفیق نصیب نہ ہو سکی۔ آپ نے بجا فرمایا کہ ''ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم من حیث القوم اُن اوصاف سے بوجوہ تہی دامن نظر آتے ہیں جو ایک غیور قوم کی پہچان ہوتے ہیں۔'' اگر آزادی کی نعمت سے فیضیاب ہونے کے باوجود ہم اپنا دینی وقار برقرار نہیں رکھ سکے تو یہ بہت بڑے خسارے کی بات ہے۔

جناب ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مقالہ ''سائنسی دور میں شاعری کا مستقبل'' اور

جناب پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی نے اپنے مضمون ''معاشرے کی تشکیلِ نو میں ادب کا حصہ'' میں ایسے ہی خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ اگر تسلسل سے فکری و نظریاتی تصورات کو زیرِ قلم لایا جاتا رہا تو اُمید ہے اصلاحِ احوال کی کوئی صورت پیدا ہو جائیگی۔ بہر حال ہم اپنے صاحبانِ علم و فراست کی قدر کرتے ہوئے اُن کی درازیٔ عمر کی دعا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی نے اس مرتبہ ''الاقرباء'' کو گرانقدر علمی سرمایہ عطا کیا ہے۔ ''جیون کتھا'' ایک منفرد نوعیت کا خاکہ ہے۔ بڑی عمدگی سے اور پُر تاثیر انداز میں ڈاکٹر صاحب نے اُردو کی داستانِ الم بیان کی ہے۔ مسرت کی بات یہ ہے کہ مجلّہ کے تمام مندرجات میں ڈاکٹر صاحب کا اسمِ گرامی نمایاں ہے۔

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کا مقالہ ''دانش افرنگ' اشتراکیت اور اقبال'' نہایت جامع او پُر مغز ہے۔ ان کی کاوش قابلِ ستائش ہے۔ یقین جانئے ''الاقرباء'' بلاشبہ ایک گلدستہءِ ادب ہے اور ہمارے اذہان اس سے معطر ہو رہے ہیں تاثیرِ دائمی کیلئے دعا گو ہوں۔

اعتذار

ہم اپنے بیرونِ ملک معاونین سے معذرت خواہ ہیں کہ گذشتہ جولائی ۲۰۰۶ء سے بین الاقوامی ڈاک کے نرخوں میں بے تحاشا بلکہ سفاکانہ اضافہ ہو جانے کے باعث الاقرباء کی ترسیل کے نرخوں پر بھی سال ۲۰۰۷ء کے لئے نظرِ ثانی کرنا پڑی ہے امید ہے ہمارے کرم فرما ازراہِ معارف نوازی ادب، پروری اپنا گراں قدر تعاون جاری رکھیں گے۔ شکریہ! (دارہ)

خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلئے)

مرتبہ

شہلا احمد

احوال وکوائف

○ **سعادتِ عمرہ:** گزشتہ دنوں رکنِ مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید گوہر علی اپنی اہلیہ محترمہ و صاحبزادی اور دونوں بچوں کے ہمراہ بیت اللہ گئے تھے۔ وہاں سب نے عمرہ کی سعادت حاصل کی۔ اللہ عزوجل شرف قبولیت بخشے۔ آمین۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء محترم گوہر علی اور دیگر شرکائے سفر سعید کو اس مبارک موقع پر دلی تہنیت پیش کرتا ہے۔

○ **ولادتِ باسعادت:** رکنِ مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن محترم سید فہیم احمد گردیزی کے صاحبزادے عزیزی کیپٹن ڈاکٹر سید عدیل حسین گردیزی کو اللہ تعالیٰ نے ایک پیارے سے بیٹے سے نوازا ہے۔ نومولود کی ولادت مورخہ ۲۵ اگست بروز جمعہ ۲۰۰۶ء کو ہوئی۔ ان کا نام سید شیث احمد گردیزی رکھا گیا ہے۔ ادارہ اس خوبصورت و مبارک موقع پر محترم و بیگم عفت گردیزی، عزیزی عدیل و شمائلہ گردیزی اور دیگر اہل خاندان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور نومولود کی خوش بختی و درازی عمر کیلئے دعا گو ہے۔

○ **بیرونِ ملک تعیناتی:** میجر سید عاصم حسین گردیزی جو محترم فہیم احمد و بیگم عفت گردیزی کے بڑے صاحبزادے ہیں، کو یو۔این۔ آبزرور کی حیثیت سے افریقہ کے ملک اریٹریا میں تعینات کیا گیا ہے۔ ادارہ انکی کامیابی اور صحت وحفاظت کے لئے دعا گو ہے۔

○ **اعلیٰ تعلیم کیلئے بیرونِ ملک روانگی:** رکنِ مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن جناب جی اے صابری و بیگم ماریہ صابری کے فرزند عزیز، معز الدین صابری گزشتہ دنوں اعلیٰ تعلیم کے سلسلے

میں اٹلی گئے ہیں۔ وہاں وہ یونیورسٹی آف میلان سے Environmental Technology میں ماسٹرز کریں گے۔ جبکہ صاحبزادی ہالہ صابری تعلیم ہی کے سلسلے میں مورخہ ۱۴ ستمبر ۲۰۰۶ء کو انگلینڈ روانہ ہوئیں جہاں وہ مانچسٹر یونیورسٹی سے Maths میں B.Sc کریں گی۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء دونوں بچوں کی اپنے مقاصد میں اعلیٰ ترین کامیابیوں کے لئے دعا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں محنت اور لگن کے بہترین ثمرات سے نوازے۔ آمین

O **اعلیٰ ترین ریکارڈ:** سیدہ مریم احمد دختر نیک اختر جناب سید نعیم احمد سیکرٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن نے ایک دفعہ پھر اپنا اعلیٰ ترین ریکارڈ برقرار رکھا اور اے لیول (A Level) پری انجینئرنگ کا امتحان تین As کے ساتھ اول پوزیشن میں پاس کرلیا۔ وہ بیکن ہاؤس کی ہونہار طالبہ رہی ہیں۔ ان کی تعلیمی شعبہ میں اعلیٰ ترین کارکردگی کے اعتراف میں بیکن ہاؤس انتظامیہ نے انہیں اسکالرشپ سے نوازنے کے علاوہ A Level کے تمام اخراجات بھی برداشت کئے۔ آج کل وہ Nust میں Mecha-tronics کے شعبہ میں زیر تعلیم ہیں۔ ادارہ سہ ماہی عزیزہ مریم احمد جناب نعیم احمد و بیگم اور دیگر اہل خانہ کو ان کی شاندار کامیابیوں پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی زندگی کے ہر شعبہ میں انہیں بہترین ثمرات سے نوازے۔ آمین

O **''ایں خانہ ہمہ آفتاب است''** سمیّہ حسن الاقرباء فاؤنڈیشن کے ممبر جناب حسن سجاد و بیگم عالیہ حسن صاحبہ کی ذہین صاحبزادی ہیں تعلیمی شعبہ میں ہمیشہ اعلیٰ ترین انعامات و اعزازات حاصل کرتی رہی ہیں۔ گزشتہ دنوں انہوں نے Head Start اسکول سے اے لیول (A level) کا امتحان تین As کے ساتھ پاس کیا ہے۔ اس اعلیٰ ترین کارکردگی کے اعتراف میں اسکول نے انہیں گولڈ میڈل سے نوازا ہے۔ مستقبل میں سمیّہ حسن LUMS سے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

☆ محمد مجاہد حسن جناب حسن سجاد و بیگم عالیہ کے صاحبزادے ہیں۔ یہ بھی اپنی ہمشیرہ کی طرح ذہین و قابل ہیں۔ یہ Software انجینئر ہیں۔ اپنے شعبہ کے ماہر' بہترین کارکردگی کی بناء پر Oxford یونیورسٹی نے انہیں اسکالرشپ سے نوازا ہے' جہاں سے وہ Software میں ایم اے کریں گے۔

☆ سید محمد حسن بھی سجاد صاحب کے صاحبزادے ہیں اور Software انجینئر ہیں۔ ان کا کینیڈا کی ایک کمپنی Electonic Art میں بحیثیت سوفٹ ویئر انجینئر تقرر ہوا ہے، چنانچہ کینیڈا جارہے ہیں۔

☆ محمد مزمل حسین جناب سجاد صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ یہ بھی اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح قابل ہیں۔ انہوں نے اس سال کلاس نہم فرسٹ پوزیشن میں پاس کی ہے۔ یہ بیکن ہاؤس میں زیر تعلیم ہیں۔

☆ جناب حسن سجاد صاحب کی بڑی صاحبزادی جن کا نام نوشین حسن ہے' آج کل کینیڈا میں رہائش رکھتی ہیں۔ ان کے شوہر وہاں ایک امریکن کمپنی میں Electronic اینڈ Computar انجینئر ہیں۔ جن کو ترقی دے کر امریکہ میں کمپنی کے ہیڈ آفس میں بطور کمپنی انچارج بھیجا جارہا ہے۔ ادارہ ان تمام کامیابیوں اور کامرانیوں پر جناب حسن سجاد و بیگم نیز تمام اہلِ خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

☆ **ولادتِ فرزند:** سینئر وائس پریذیڈنٹ الاقرباء فاؤنڈیشن محترم سید ممتاز اللہ سالاری کے فرزندِ ارجمند جناب سید مدثر اللہ سالاری کو اللہ تعالیٰ نے دولت فرزند سے نوازا ہے۔ نومولود کی ولادت ۹ ستمبر بروز ہفتہ ۲۰۰۶ء کو ہوئی۔ ان کا نام سید محمد اکرام اللہ سالاری رکھا گیا ہے۔ اس پر مسرت و مبارک موقع پر ادارہ سہ ماہی الاقرباء محترم ممتاز اللہ سالاری' عزیزی مدثر اللہ' عزیزہ لبنیٰ اور دیگر اہل خاندان کو دلی تہنیت پیش کرتا ہے اور فرزند کی خوش بختی و درازیِ عمر کیلئے دعاگو ہے۔
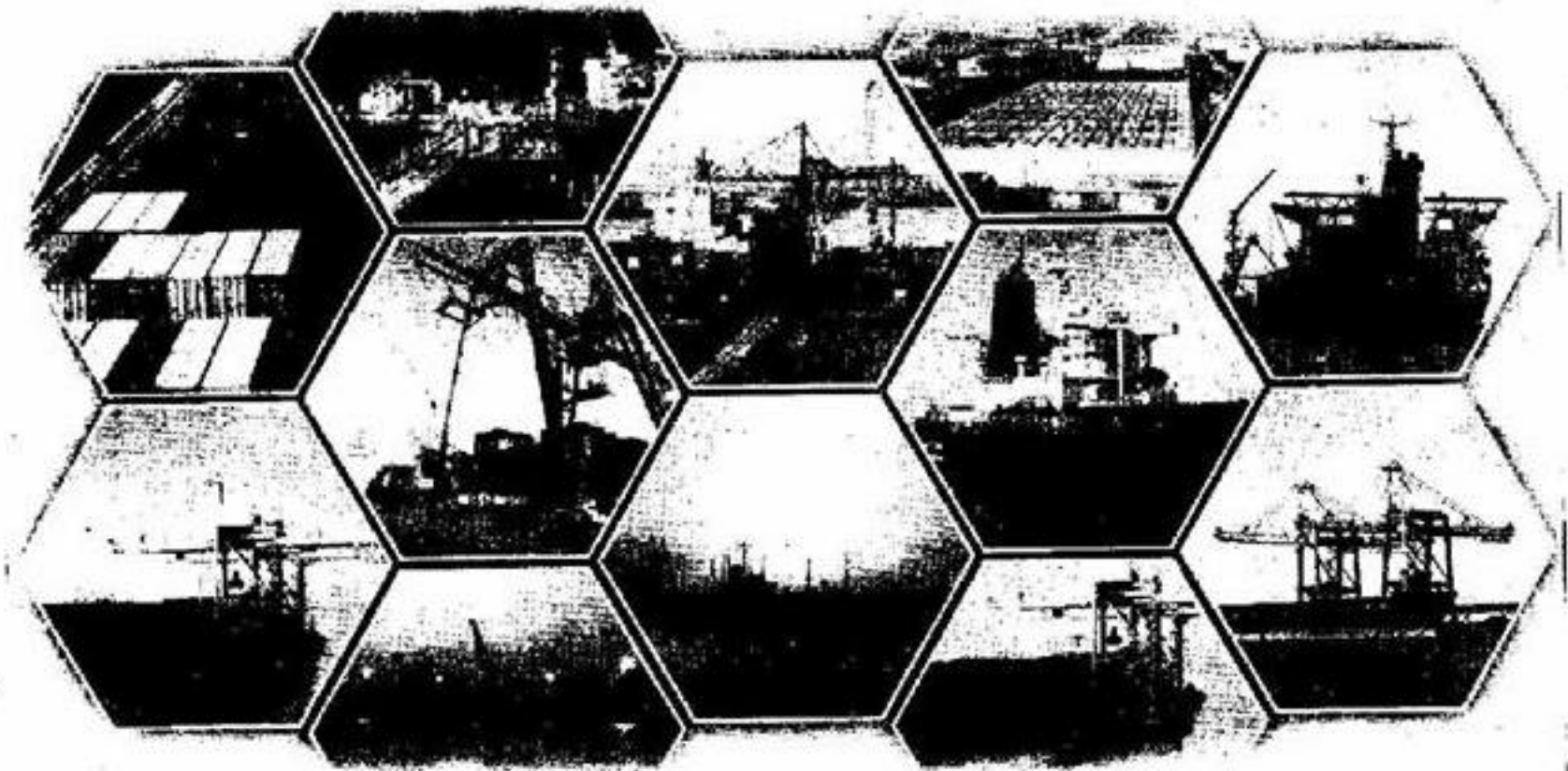
ترنم صدیقی

ملیشیا کی حیرت انگیز ترقی کی مختصر داستان

اس سال ستمبر میں مجھے ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شامل ہونے کے سلسلے میں ملیشیا میں تقریباً دو ہفتہ گزارنے کا اتفاق ہوا۔ اس سلسلے میں بہت سے شہر اور دیہات دیکھے۔ ہر قسم کے لوگوں سے ملاقات ہوئی، اعلیٰ افسران، ماتحت افسران، عام لوگ، دوکاندار، بزنس مین، سرکاری اور غیر سرکاری گاڑیوں کے ڈرائیوران سب سے گفتگو کرنے کا موقع ملا جس کی وجہ سے ملیشیا کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہوئیں۔

ملیشیا کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے لیکن ملیشیا تمام اسلامی ملکوں میں سب سے زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ ملک ہے۔ اس کے عوام جس میں مسلمان، عیسائی اور ہندو ہیں بڑی ہم آہنگی امن اور چین کے ساتھ رہتے اور کام کرتے ہیں۔ کئی جگہ یہ مشاہدہ ہوا کہ گرجہ، مندر اور مسجد ساتھ ساتھ بنے ہوئے ہیں لیکن کوئی مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ تعصب کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ ملیشیا کی ترقی کا دور اس کی ۱۹۵۷ء میں آزادی کے بعد شروع ہوا ٹینکو عبدالرحمٰن بحیثیت بابائے قوم پہلے وزیر اعظم بنے انھوں نے قوم کو دو قومی نظریہ دیا۔ ایک قومی نظریہ (National Vision) دوسرا ملکی نظریہ (Country Vision) قومی نظریہ کے تحت اس میں سب سے مقدم انھوں نے قوم کی تعلیم اور تربیت کو دیا اور بے شمار طلبہ و طالبات کو سرکاری خرچ پر اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھیجا، ان کے بعد دوسرے آنے والوں نے اس کو قائم رکھا، ملک کی معیشت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ملیشیا کے لیڈروں نے ایک نئی نوجوان، منظم، محنتی اور راست باز قوم کو پیدا کر دیا۔ یہ نوجوان نسل محنت، مشقت، ایمانداری، اعلیٰ تعلیم، عاجزی اور انکسار کی دولت سے مالا مال ہو کر قوم کو بڑی تیزی سے جاپان کے مد مقابل لانے کے لئے کوشاں ہے۔ ہر

ایک کا یہی نعرہ ہے کہ مغرب کی طرف مت دیکھو' مشرق کی طرف نظر ڈالو اور جاپان کی طرح ترقی کرو۔ انہوں نے قوم کو سب سے آگے بڑھنے کا جذبہ یوں دیا ہے کہ ان کا جھنڈا دنیا کے بلند ترین کھمبے پر لہرا رہا ہے۔ اور ہر بچے کو ترغیب دی جاتی ہے کہ اپنے جھنڈے کی بلندی کو قائم رکھو کیونکہ یہ جھنڈا اپنی بلندی کے باعث تمام جھنڈوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

قومی نظریہ کے تحت ان کا موجودہ زور اس امر پر ہے کہ ملک کو ایک مضبوط صنعتی ملک بنائیں لیکن ۲۰۲۰ء تک کوئی ملیشین مزدور نہیں بنے گا' مزدوری کے لئے پاکستان' انڈونیشیا' تھائی لینڈ' ہندوستان اور فلپائن سے مزدور لائے جائیں گے۔ تمام دیہاتی آبادی کو شہر میں منتقل کیا جائے گا' تمام قابل کاشت زمینوں میں مشینی کاشت (Mechanised Farming) کی جائے گی اور اس پر صرف وہ فصل اُگے گی جس کی بین الاقوامی منڈی میں قیمت زیادہ ہے۔ ہر شہر میں نہایت عمدہ ہسپتال' اسکول' کالج' مدرسے اور مسجدیں تعمیر کی جائیں گی اس پروگرام پر تیزی سے عمل ہو رہا ہے۔ ہر شہر میں پبلک ٹرانسپورٹ کا اعلیٰ نظام قائم کیا جائے گا۔ چونکہ تیزی سے صنعتی اور زرعی ترقی آگے بڑھ رہی ہے اس لیے ان کی موجودہ آبادی کم ہے لہٰذا انہیں باہر سے لوگوں کو بلانا پڑتا ہے۔ اس کمی کو بھی دور کرنے کے لئے آبادی میں اضافے کی تجویز ہے لیکن اس کو اس طرح عمل میں لائے ہیں کہ صرف ایسے لوگوں کو دوسری یا تیسری شادی کی اجازت دی گئی ہے جن کی کم سے کم مقررہ تنخواہ سے آمدنی زیادہ ہو تاکہ وہ بچوں کی اچھی طرح پرورش اور تعلیم کر سکیں اور آبادی کی وجہ سے غربت میں اضافہ نہ ہو۔

ملکی نظریہ کے تحت سائنس' ریاضی' بزنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا جائے گا۔ ریسرچ پر خاص رقم خرچ کی جائے گی' اعلیٰ تعلیم کے لئے بچوں کو ترغیب دی جائے گی اور ان کی تمام ضروریات کا سو فیصد خرچ حکومت برداشت کرے گی۔ سنگاپور کو ملیشیا سے ملانے کے لئے ایک پل بنانے کی تجویز تھی جس پر تقریباً چھ بلین ملیشین رنگٹ سے زیادہ خرچ کا اندازہ تھا

لیکن موجودہ وزیراعظم نے اس تجویز کو مسترد کردیا کیونکہ اس سے ملیشیا کو بہت زیادہ فائدے کی امید نہیں تھی اس کے برعکس انہوں نے فیصلہ کیا کہ سنگاپور کے مدمقابل چار سے پانچ سال کے اندر ایک ایسا شہر تعمیر کیا جائے جو کہ سنگاپور سے سبقت لے جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ سنگاپور سے لوگ صرف جنگل کی سیر کرنے کے بجائے خرید وفروخت کے لئے آئیں گے کیونکہ ملیشیا میں قیمتیں کم ہیں اس طرح ملیشیا میں ایک نیا شہر آباد ہوگا اور اسے مالی فائدہ پہنچے گا۔ کوالالمپور چونکہ انتہائی تجارتی اور صنعتی شہر بن چکا ہے لہٰذا عمدہ اور سودمند پالیسی بنانے کے لئے ایک پرسکون جگہ کی تلاش میں ملیشیا کی حکومت نے کوالالمپور سے تیس کلومیٹر دور ایک نئے دارالخلافہ پتراجایہ کی تعمیر کی ہے۔ یہ نام ٹینکو عبدالرحمٰن سے منسوب ہے۔ اس میں سوفٹ گہری مصنوعی جھیل، وزیراعظم کا آفس، بادشاہ کا محل، شاہی مسجد، کونشن سنٹر، حکومت کے مختلف دفاتر اور ملازمین کے لئے رہائشی مکانات بن چکے ہیں اور بن رہے ہیں۔ اکثر دفاتر منتقل ہو چکے ہیں۔ یہ شہر اپنی نوعیت کا ایک نادر نمونہ ہے اس مصنوعی جھیل پر نہایت ہی خوبصورت پلوں کی تعمیر کی گئی ہے جن کا نظارہ نہایت ہی پرلطف ہے۔ اس کی سڑکیں اور فٹ پاتھ رنگین ٹائلوں سے بنائے گئے ہیں، اسٹریٹ لائٹ ماحولیات کے لحاظ سے بدلتی ہیں۔ ایک ہی سڑک پر تین مختلف قسم کے اسٹریٹ پول اور اسٹریٹ لائٹ ملے گی جن کی ڈیزائنگ ان کے قومی پھول چینی گلاب (Hibiscus) کی شکل میں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر انجینئروں اور آرٹسٹوں نے مل کر بنایا ہے۔ اتنی شاندار تعمیرات کے باوجود کہیں فضول خرچی اور بے ضرورت تعمیر کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اس دارالخلافے کو ایک زیرزمین سرنگ سے ملایا جارہا ہے جس کی وجہ سے کوالالمپور سے یہاں تک کا فاصلہ صرف دس منٹ میں طے ہوگا۔

ملیشیا کی تیرہ ریاستیں ہیں ہر ریاست کا ایک بادشاہ ہے لیکن ملیشیا پر یورپین قبضے کے بعد دو ریاستوں کے بادشاہ ملیشیا چھوڑ کر چلے گئے اس طرح ان کی بادشاہت ختم ہوگئی۔ اس وقت گیارہ بادشاہ (راجہ) موجود ہیں ان میں سے ایک پانچ سال کے لئے پورے ملک کا بادشاہ منتخب

ہوتا ہے۔ اس طرح ہر ریاست کے ولی کو زندگی میں ایک مرتبہ بادشاہ بننے کا موقع ملتا ہے لیکن وزیر اعظم اور اسمبلی کے ممبران ووٹ سے منتخب ہوتے ہیں۔ تیرہ صوبوں میں سے ایک صوبے میں مخالف جماعت کی حکومت ہے جو مذہبی پارٹی ہے۔ سنٹرل اسمبلی میں بھی ان کے نمائندے موجود ہیں جو حکومت کی کارکردگی پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور عوام کو باخبر رکھتے ہیں۔

حکومت کی کارکردگی بہت عمدہ ہے، رشوت، کرپشن، بے ایمانی اور ہر قسم کی دھوکہ دھڑی سے معاشرہ پاک ہے۔ ہر کام کی مدت مقرر ہے مثال کے طور پر پاسپورٹ ایک دن میں بنتا ہے اور تجدید اس کی ایک گھنٹے میں ہوتی ہے۔ کوئی مکان کے لئے درخواست دے تو ایک ہفتے میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ سرکاری دفاتر کے اوقات ساڑھے آٹھ بجے سے ہیں لیکن بیشتر سرکاری افسر اور ماتحت وقت سے پہلے موجود ہوتے ہیں اور شام کو دیر سے گھر جاتے ہیں۔ یہ اپنی مرضی، خوشی اور ملک کی محبت سے سرشار ہو کر کام کرتے ہیں۔

اسلام نے صفائی کو نصف ایمان قرار دیا ہے۔ ملیشیا نے اسے بڑی سختی سے اختیار کیا ہے۔ سڑک، فٹ پاتھ، ہسپتال، آفس جہاں جائیں بے مثال صفائی ہے۔ چھوٹے چھوٹے کھانے کے اسٹالوں پر بھی اعلیٰ معیار کی صفائی ہے۔ کھانے نہایت عمدہ، پاکیزہ اور بالکل ملاوٹ سے پاک ہیں۔ باوجود اس کے کہ پورا ملک جنگلات پر ہی مشتمل ہے پھر بھی درختوں کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ درخت کاٹنا جرم ہے اور اس کی سخت سزا ہے۔ اگر حکومت کو کاٹنا بھی پڑا تو اس کی جگہ دو لگا کر ایک مدت تک انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک مخصوص اونچائی تک پہنچ جائیں۔ جب منارہ ٹاور جو کہ دنیا کا چوتھا طویل مواصلاتی ٹاور ہے کی تعمیر ہو رہی تھی تو ایک صرف ۹۷ سالہ درخت زد میں آ رہا تھا اس کو بچانے کے لئے حکومت نے ۳،۵ ملین رنگٹ خرچ کیے تا کہ اس کی جڑوں کو نقصان نہ پہنچے غالباً اس وجہ سے پورے ملک پہ اللہ کی رحمت برستی نظر آتی ہے۔

ملیشیا کی آبادی تقریباً چھبیس ملین ہے جس میں ۴۵ فیصد ہندو اور چینی ہیں لیکن ان میں

آپس میں ہم آہنگی ہے۔ دفتروں، سپر مارکیٹ اور عام دکانوں میں عورتوں کی اکثریت ہے جو تعلیم یافتہ، کارگزار اور محنتی ہیں۔ یہاں عورت اور مرد شانہ بشانہ کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اور کہیں کسی قسم کی شکایت مشاہدے میں نہیں آئی۔ مخنثوں کو بھی یہاں کوئی نفرت سے نہیں دیکھتا۔ ایک اعلیٰ قسم کی بوتیک میں ایک مخنث کو گاہکوں کے ساتھ انہماک کے ساتھ کپڑا فروخت کرتے دیکھا۔

جیسے کہ کہا گیا ہے اور میں نے مشاہدہ بھی کیا کہ جہاں معاشرہ اچھا ہو وہاں کے جانوروں اور پرندوں پہ بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ ایک پُر فضا مقام پر جانے کا اتفاق ہوا، وہاں دوسرے سیاحوں کا بھی ہجوم تھا، وہاں میں نے بے شمار روپہلے رنگ کے بندر دیکھے اور ان کی عجیب خصلت دیکھی۔ لوگ انہیں چنے اور مونگ پھلی تقسیم کر رہے تھے لیکن ان بندروں میں ذرا برابر بھی چھینا جھپٹی نہیں دیکھی، ایک لیکر ہٹتا تو دوسرا آتا دو تین اکٹھے جھپٹتے نہیں دیکھا۔ ایک آخری بندر کو جب کچھ نہیں ملا تو دینے والے کے پاس آکر انتہائی لجاجت سے اس کی طرف دیکھنے لگا، دینے والے اور دیکھنے والے کا دل پسیج گیا۔

اکثر مسلم ممالک اپنے افسران کو تربیت کے لئے انگلینڈ، امریکہ اور آسٹریلیا بھیجتے ہیں، جس کا اب تک پاکستان کی ساٹھ سالہ زندگی میں کوئی خاطر خواہ نتیجہ نظر نہیں آیا۔ میری تجویز ہے کہ طلبہ و طالبات نیز سرکاری اور نجی اداروں کے لوگوں کو ملیشیا جانے کی ترغیب دی جائے، مجھے امید ہے کہ یہ بہتر انسان بن کر آئیں گے اور اپنے ادارے کو بہتر طور پر چلا سکیں گے۔ کاش اس تجویز سے ہمارے پالیسی سازوں کو رہنمائی ملے۔

"مسلمان دوسری قوموں سے معاہدہ کر سکتے ہیں ان سے تعاون کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنے جداگانہ وجود کو دوسری قوموں میں ضم نہیں کر سکتے، اسلام کا سب سے بڑا مقصد ایک ایسی ملّت کو وجود میں لانا ہے جو رنگ ونسل، ذات پات اور زبان کے امتیاز سے بلند ہو"۔

مولانا نے لوگوں کو بتایا کہ "پاکستان ایک ایسی اسلامی ریاست کے قیام کی طرف پہلا قدم ہے جو کتاب وسنت پر مبنی ہو گی لیکن یہ ریاست اچانک اسلامی نہیں ہو جائے گی ہاں آگے چل کر وہ اسلامی رنگ اختیار کر سکتی ہے"

انہوں نے مزید کہا کہ

"مسلم لیگ میں کئی خرابیاں ہیں لیکن علما کثیر تعداد میں مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں تو وہ ان خرابیوں کو دور کر سکتے ہیں جب کانگریسی علماء نے کہا کہ پاکستان کا قانون مغربی نظریوں کے مطابق ہو گا تو مولانا عثمانی نے جواب دیا کہ "اگر ایسا ہوا تو اسکی ذمہ داری آپ پر ہو گی آپ لوگ مسلم لیگ میں شامل ہو کر ان لوگوں کو کیوں نکال باہر نہیں کرتے جو اسلامی قانون نہیں چاہتے۔"

مختصر یہ کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کی کوششوں سے پاکستان کی تحریک کو مسلمانوں میں مقبول بنانے میں بڑی مدد ملی ۱۹۴۷ء میں جب انگریزوں نے پاکستان قائم کرنے کا مطالبہ مان لیا تو یہ شرط بھی لگائی کے صوبہ سرحد اور آسام کا ضلع سلہٹ صرف اسی وقت پاکستان میں شامل ہو سکیں گے، جب یہاں کے تمام لوگ "استصوابِ رائے" کے ذریعے ایسا فیصلہ کر لیں یہ بڑا نازک موقع تھا کیونکہ ان دونوں مقامات پر کانگریس کے حامیوں کا بڑا اثر تھا اور سلہٹ میں ہندوؤں کی تعداد بہت تھی لیکن مولانا عثمانی نے مسلسل دورے کر کے یہاں کے مسلمانوں کو پاکستان میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ جب رائے لی گئی تو ان دونوں علاقوں کے لوگوں کی اکثریت نے

پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا اس کامیابی پر جب مولانا شبیر احمد عثمانی نے قائداعظم کو مبارک باد دی تو انھوں کہا،

''یہ سب کچھ آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ کہ استصواب میں کامیابی ہوئی''

مولانا شبیر احمد عثمانی کی ایسی خدمات تھیں جن کی وجہ سے پاکستان قائم ہونے پر جب ۱۴۔اگست کو کراچی میں پاکستان کا جھنڈا لہرانے کی تقریب ہوئی تو جھنڈا لہرانے کے لیے قائداعظم نے مولانا ہی کا انتخاب کیا چنانچہ پاکستان کا جھنڈا مولانا شبیر احمد عثمانی کے مبارک ہاتھوں ہی سے لہرایا گیا۔

پاکستان قائم ہو جانے کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی صرف سوا دو سال زندہ رہے لیکن اس مختصر مدت میں انھوں نے پاکستان کو ایک اسلامی مملکت میں تبدیل کرنے کے لیے جو کوششیں کیں وہ پاکستان کی تاریخ میں بڑی اہم ہیں۔مولانا شبیر احمد عثمانی پاکستان آنے کے بعد پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن بنا دیے گئے تھے،اس اسمبلی کا کام ملک کا آئین تیار کرنا تھا تاکہ اس کی روشنی میں حکومت کا نظام قائم کیا جا سکے۔

پاکستان اگرچہ اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا لیکن دستور ساز اسمبلی میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو پاکستان کو اسلامی مملکت کے بجائے ایک غیر مذہبی ریاست بنانا چاہتے تھے یہ لوگ کھل کر تو اسلام کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتے تھے لیکن حکومت کے اندر چپکے چپکے اپنی کوششوں میں مصروف تھے ان کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی اور دوسرے اسلام پسند رہنماؤں نے پورے ملک میں اسلامی دستور کے لیے زبردست مہم چلائی اور مختصر عرصے میں اسلامی دستور کے حق میں فضا تیار کر دی، چنانچہ عوام کی ان خواہشات کے مطابق دستور ساز اسمبلی نے ۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو ایک تجویز منظور کی جو قرارداد مقاصد کہلاتی ہے، یہ قرارداد پاکستان کی دستوری تاریخ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس دستور ساز اسمبلی نے یہ عہد کیا کہ پاکستان کا آئین اسلامی اصولوں کی روشنی میں بنایا جائے گا۔

لیکن یہ قرارداد اتنی آسانی سے منظور نہیں ہوئی اور اس کو منظور کرانے میں مولانا شبیر احمد عثمانی کا بڑا ہاتھ ہے، حکومت پاکستان میں کچھ لوگ ایسے تھے جو اسلامی آئین سے ڈرتے تھے یا شرماتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ یہاں بھی ویسی ہی قرارداد منظور کر لی جائے جیسی کچھ دنوں پہلے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی تھی لیکن مولانا نے بڑی ہمّت سے ان لوگوں کا مقابلہ کیا اور اسلام پسند ارکان کے تعاون سے جن میں مولانا اکرم خان مرحوم کا نام نمایاں ہے مذکورہ بالا قرارداد منظور کروائی۔

اسمبلی میں قرارداد مقاصد وزیر اعظم لیاقت علی خان نے پیش کی تھی اور اس کی تائید مولانا شبیر احمد عثمانی نے کی تھی، مولانا نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

”میں لیاقت علی خان کی پیش کی ہوئی اس قرارداد کی نہ صرف تائید کرتا ہوں بلکہ ان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے اس دور میں جب کہ مادّی قوتیں اپنے عروج پر ہیں ایک ایسی قرارداد پیش کی“

اس موقع پر مولانا نے جو تقریر کی اس میں اسلام کے سیاسی نظام کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

”اگر ہم دنیا کے سامنے ایک مثال قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنا ہوگا اسلام اس غلط نظریہ کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا کہ مذھب صرف خدا اور بندے تک محدود ہے اور اس کا روزانہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، اسلام زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے اسلام صرف مذہبی عقائد اور احکام تک محدود نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطہ ہے جس کا اطلاق پورے مسلم معاشرے پر ہوتا ہے۔“

مولانا نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ ایک اسلامی ریاست کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے چلانے والے مولوی ہوں گے اسلامی ریاست تو وہ ہے جو اسلام کے اعلیٰ اور بلند اصولوں کے تحت چلائی جائے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے کہا کہ :شوریٰ یعنی ایک دوسرے سے مشورہ کرنا اسلامی ریاست کا پہلا اور بنیادی اصول ہے اور اسلامی ریاست دنیا کی پہلی ریاست تھی جس نے استبداد کا خاتمہ کیا اور اس کی جگہ شوریٰ قائم کی۔ اسلامی ریاست کا پہلا اور سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ وفادار غیر مسلم رعایا کی جان و مال کی حفاظت کرے معاشی اور اقتصادی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عثمانی نے فرمایا:

> "اسلام سرمایہ داری کا قائل نہیں اس کے اپنے طریقے ہیں جن کے تحت وہ دولت کو گردش میں رکھتا ہے تاکہ وہ تمام لوگوں تک پہنچے اور کسی ایک گروہ کے ہاتھ میں ساری دولت جمع نہ ہو جائے اور یہ طریقے کمیونسٹوں کے طریقوں سے قطعی مختلف ہیں۔ یہ بات نہیں بھولنا چاہئے کہ موجودہ دور میں معاشی عدم توازن کی وجہ سے کمیونزم زور پکڑ رہا ہے، کمیونزم سے بچنا چاہتے ہیں تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پاکستان کو ایک صحیح اسلامی ریاست بنایا جائے۔"

قرارداد مقاصد اسلامی دستور کی طرف پہلا قدم تھا اس کی منظوری کے بعد دستور ساز اسمبلی نے آئین بنانے کا کام شروع کر دیا اسمبلی کی اسلامی امور پر رہنمائی کے لیے ۱۹۴۹ء کے وسط میں حکومتوں نے تعلیمات اسلامی بورڈ قائم کیا جو ملک کے بڑے بڑے علماء پر مشتمل تھا اس بورڈ کی نگرانی مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا اکرم خان کے سپرد کی گئی۔ آئین کی تیاری کا کام ابھی جاری تھا کہ ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بہاولپور میں مولانا شبیر احمد عثمانی کا انتقال ہو گیا۔

بیگم طیبہ آفتاب

گھریلو چٹکلے

○ چہرے سے پمپلز دور کرنے کیلئے: پمپلز چہرے کے حسن کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان سے نجات کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ ان پر ٹوتھ پیسٹ یا آفٹر شیو لوشن لگا کر تھوڑی دیر کیلئے چھوڑ دیں اور پھر منہ دھولیں۔ انشاء اللہ جلد ہی چہرہ صاف ہو جائے گا۔

○ آنکھوں کے نچلے حصہ سے تھکن کے غلاف دور کرنے کیلئے: بسا اوقات تھکن یا نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں کے نچلے حصہ پر غلاف سا ابھر آتا ہے اس سے نجات کیلئے ایک چائے کا چمچہ تازہ نیم کے پتے' ایک چمچ سبز دھنیا' ایک چمچ کھیرا لے کر ایک چمچ قہوہ کے ساتھ پیس کر یکجان کرلیں اور غلاف پر لگائیں۔ بہت جلد فائدہ ہوگا۔

○ آلوؤں کی مٹھاس دور کرنے کیلئے: موسم گرما میں اکثر آلو میں کچھ مٹھاس سی آجاتی ہے جو پکنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی اور ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ اس کو ختم کرنے کیلئے آلوؤں کو کاٹ کر ان پر لہسن' سرکہ اور نمک لگا کر تین چار گھنٹے رکھ کر پکائیں۔

○ جسم میں خون کی کمی ہو جائے تو: جسم میں خون کی کمی کو کلیجی کے استعمال سے بھی دور کیا جا سکتا ہے لیکن بعض لوگ اسے ہضم نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگوں کیلئے گاجر اور چقندر کا استعمال سود مند رہتا ہے۔ ایک گاجر اور ایک چقندر باریک باریک کاٹ کر دو کپ پانی میں ابلنے کیلئے رکھ دیں۔ جب پانی ایک کپ رہ جائے تو اسے ٹھنڈا کر کے پی لیں۔ ایک ماہ کے مسلسل استعمال سے خون کی کمی دور ہونے کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی شاداب ہو جائے گا۔

○ پسینے کے داغ دور کرنے کیلئے: اکثر قمیص یا بلاوز وغیرہ کے بغلی حصوں پر پسینے کے داغ پڑ جانے کی وجہ سے پورا کپڑا دھونا پڑ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں پریشانی سے بچنے کیلئے پانی میں سفید سرکہ ملا کر صرف بغلی حصوں کو پانی میں ڈبو کر اور مل کر دھولیں اور دھوپ میں خشک کرلیں۔

داغ جاتے رہیں گے۔

○ **درد شقیقہ سے نجات کیلئے:** سورۃ التکاثر (پارہ ۳۰) بعد نمازِ عصر پڑھ کر مریض کے سر پر دم کرنے سے درد شقیقہ اور درد سر دونوں کو آرام آ جائے گا۔ اس کے علاوہ تازہ لیموں کے چھلکے کو کوٹ کر باریک کر لیں اور سر اور پیشانی پر مل لیں۔ درد جاتا رہے گا۔ اس کے علاوہ ریٹھے کا چھلکا بھی اس مرض میں مفید ثابت ہوتا ہے۔ ایک عدد ریٹھے کا چھلکا تھوڑے سے پانی میں اتنا ملیں کر جھاگ بن جائیں۔ اس جھاگ کے دو قطرے ناک میں دن میں تین دفعہ ٹپکائیں۔ انشاءاللہ جلد فائدہ ہوگا۔

○ **گھونگھریالے بال سیدھے کرنے کیلئے:** بعض لوگوں کو گھونگھریالے بال پسند نہیں ہوتے۔ انہیں سیدھا کرنے کیلئے ایک کھانے کا چمچ آملہ پاؤڈر دو کھانے کے چمچ مہندی، کتھا آدھا پاؤ انار کے چھلکے کا پاؤڈر ایک کھانے کا چمچ، ایک عدد انڈے کی سفیدی، گھی گوار (ایلو ویرا) ایک کھانے کا چمچ لے کر ان سب کو اچھی طرح پھینٹ لیں اور اس آمیزے کو پندرہ منٹ کیلئے بالوں میں لگا کر چھوڑ دیں۔ سوکھ جانے پر بال دھولیں۔ مہینے میں تین بار یہ عمل کریں۔ انشاءاللہ فائدہ ہوگا۔

○ **کیل مہاسوں سے نجات کیلئے:** عرق گلاب اور گلیسرین ہم وزن لے کر یکجان کر لیں اور روئی کے باسی ٹکڑے کی مدد سے چہرے پر ماسک کی طرح لگالیں۔ چند بار کے استعمال سے کیل مہاسے ختم اور چہرہ صاف ہو جائے گا۔

○ **چہرے کی رنگت نکھارنے کیلئے:** گرمی کی شدت سے اکثر چہرے کی جلد خراب اور رنگت سانولی ہو جاتی ہے۔ اس سے بچنے کیلئے خشک گلاب کی پتیاں پیس کر اس سفوف کے ہم وزن بیسن میں ملالیں۔ اور اس میں دودھ ڈال کر پیسٹ سا بنا کر ہفتہ میں ایک بار چہرے اور گردن پر لگائیں۔ خشک ہونے پر ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ لیکن خیال رہے یہ عمل کرنے سے پہلے چہرے اور گردن کو برف سے ٹھنڈا کیے ہوئے پانی سے اچھی طرح دھولیں۔

Conquering new Frontiers

Entering in the World of Progress